باسمہ سبحانہ وتعالیٰ

یادگارِ زمانہ ہیں یہ لوگ

گذشتہ نصف صدی کے حضرات علماء
صلحاء، شعراء، دانشوروں اور قومی رہنماؤں
کی مثالی زندگی کا ایک مختصر جائزہ!

از

سید محمد ازہر شاہ قیصر

ادارۂ انور [illegible] دیوبند

تفصیل

کتاب کا نام	یادگارِ زمانہ ہیں یہ لوگ
ضخامت	۱۶۰ صفحات
اڈیشن اول کی تعداد	ایک ہزار
طابع و ناشر	نسیم اختر، شاہ منزل دیوبند
کاتب	مقبول احمد (فاضل دیوبند)
طباعت وغیرہ کی نگرانی	مولانا سید محبوب رضوی، تعلیمی مرکز دیوبند
مجلد نسخہ کی قیمت	

ملنے کا پتہ

نسیم اختر۔ شاہ منزل دیوبند
ضلع سہارنپور

(محبوب پریس، دیوبند)

راہنما

سفر نامہ

آغشتہ ایم ہر سرِ خارے بخونِ دل
قانونِ باغبانیٔ صحرا نوشتہ ایم

انسان کی یہ عارضی زندگی ایک مسلسل سفر ہے، اس سفر میں ہمیں کچھ ساتھی ملتے ہیں جو عارضی رفاقت کے بعد ہم سے جدا ہو جاتے ہیں، کسی اسٹیشن پر اچانک یہ ہمارے قریب آ بیٹھتے ہیں اور پھر اگلے کسی اسٹیشن پر کچھ کہے سنے بغیر اتر جاتے ہیں، خود ہمارا سفر ابھی جاری ہے کچھ خبر نہیں کہ سفر کا اختتام کب اور منزل کہاں ہوگی۔

ذوقؔ اس بحرِ رواں میں کشتیٔ عمرِ رواں
جس جگہ پر جا لگی وہ ہی کنارہ ہو گیا

اس عارضی رفاقت میں بعض شخصیتوں نے اپنی دماغی اور باطنی صلاحیتوں کے انمٹ نقوش ہمارے حافظہ اور ذہن پر بنائے، ان نقوش نے جب حروف و الفاظ کی شکل اختیار کی تو وہ ان شخصیات پر کچھ ادھورے بے جوڑ اور بے مزہ مضامین کی صورت پا گئے۔

میری زندگی شروع سے عزلت پسند اور گوشہ گیر رہی ہے، اپنی رائے کی انفرادیت اور اپنے ذہن و فکر کے ایک خاص انداز کی وجہ سے نہ کبھی میں مجلس کا آدمی بنا اور نہ مجھے تعلقات بنانے کا سلیقہ آیا۔

کچھ بڑے حضرات، کچھ متبحر علماء، کچھ ارباب ادب و صحافت اور کچھ مشاہیر سیاست خود اپنی محبت و عنایت سے مجھ پر متوجہ رہے، انہی کی

یاد میری زندگی کا ایک سرمایہ اور انہی کی پرکشش زندگی میرے نزدیک انسانیت کا ایک معیار ہیں۔ بقول حسرت ؎

نہیں آتی تو یاد ان کی مہینوں تک نہیں آتی
مگر جب یاد آتے ہیں تو اکثر یاد آتے ہیں

یہ مضامین میرے اور سینکڑوں مضامین کی طرح گوشۂ گمنامی میں پڑے ہوئے تھے مگر میرے بچوں اظہر شاہ، راحت اور نسیم اختر کو اس کی فکر رہتی ہے کہ میرے مضامین کو سنبھال کر رکھیں، انہی کی محنت سے اخبارات کے فائلوں سے یہ مضامین فراہم ہو سکے ہیں۔ میں سوچتا ہوں کہ میرے بزرگوں میں اب کون ایسے افراد رہ گئے ہیں جو اپنے چھوٹے بھائی کی اس ہذیان سرائی اور بے کار محنت کی بھی حوصلہ افزائی فرمائیں تو مجھے والد محترم حضرت فخر المحدثین علامہ سید محمد انور شاہ کشمیری کے ارشد تلامذہ کی اس جماعت کے سوا جو اب تک ہند و پاکستان اور دوسرے ممالک میں موجود ہے کوئی نظر نہیں آتا اور میں انہی حضرات کی خدمت میں یہ مضامین نذرانۂ عقیدت کے طور پر پیش کرتا ہوں۔

میرے تینوں بچے (جن کے نام میں اوپر لکھ چکا ہوں) بہت شوق اور حوصلہ کا اظہار کرتے اور ارادہ کرتے ہیں کہ اس مجموعہ کے بعد میرے اور مضامین کو بھی اسی طرح شائع کریں گے۔ وباللہ التوفیق

سید محمد ازہر شاہ قیصر

سخنہائے گفتنی

"مولانا شاہین جمالی ۔ اڈیٹر دیوبند ٹائمز"

حال کے بیدار لمحوں کو قلم کے آبشار میں بہا دینا کوئی زیادہ مشکل کام نہیں لیکن بیتے لمحوں کو قلم کی نوک سے چھیڑ کر گدگدانا اور انھیں خواب گراں سے جگانا انتہائی مشکل اور دشوار کام ہے، پچھلے واقعات اور گذری ہوئی زندگیوں کو صحت بیان کے ساتھ سامنے رکھدینا اس وقت ممکن ہے، جب ایک اہل قلم کو صحت حافظہ، تجزیہ و مطالعہ کی پوری صلاحیت، مختلف زندگیوں اور ان زندگیوں کی مختلف اداؤں کو سمیٹ لینے کی قوت اور طرز نگارش اور بیان و ادا کے گہرے اسالیب پر پوری دسترس حاصل ہو۔ ہم سمجھتے ہیں کہ اگر کوئی اس مشکل کو آسان بنا سکا ہے تو وہ نامور صحافی، صاحب طرز ادیب اور مشہور انشا پرداز مولانا سید ازہر شاہ صاحب قیصرؔ کا قلم ہے، جس نے پچھلی نصف صدی کے ہم عصر بزرگوں کو ادب و احترام اور دلبستگی کو بے تکلفی کے ساتھ کاغذ کے بیجان صفحے پر زندگی بخش دی ہے، لمحے جاگ پڑے ہیں اور جس عہد نے ماضی میں آنکھیں موند لی تھیں اس نے حال میں آنکھیں کھول دی ہیں۔

"یادگار زمانہ ہیں یہ لوگ" میں ماضی کے جن سوتے ہوئے لمحوں کو جگایا گیا ہے ان کو شاہ صاحب کے قلم نے آب حیات دیا ہے اور انھوں نے ان لمحوں سے وابستہ شخصیات کے "سوانحی خاکوں" میں قوس قزح کے سے حسین رنگ بھر دیئے ہیں جن سے قلمی چہروں کی چمک دمک اور بڑھ گئی ہے۔

اس موقع پر ہم اس حقیقت کے اظہار میں تامل مناسب نہیں سمجھتے کہ شاہ صاحب کے نکتہ رس اور فن شناس قلم نے بیتے لمحوں اور ماضی کی بھولی بسری مگر ناقابل فراموش شخصیتوں کا عکس فن کے شیشے میں اس طرح اتار لیا ہے کہ بقول جگر مرحوم ؎

وہ کب کے آئے بھی اور گئے بھی نظر میں اب تک سما رہے ہیں
یہ چل رہے ہیں، وہ پھر رہے ہیں، یہ آرہے ہیں وہ جا رہے ہیں

کا منظر نگاہوں کے سامنے رقص کرنے لگتا ہے۔

اس کتاب میں علم وادب، دین ودانش اور سیاست وصحافت کی جن سربرآوردۂ روزگار شخصیات کا تذکرہ ہے ان میں امام العصر حضرت مولانا سید انور شاہ صاحب کشمیریؒ، علامہ شبیر احمد عثمانی، مولانا عبید اللہ سندھی، علامہ مناظر احسن گیلانی، مولانا عبدالرحمن امروہوی، مولانا حفظ الرحمن سیوہاروی، مولانا حبیب الرحمن لدھیانوی، سید عطاء اللہ شاہ بخاری، مولانا ظفر علی خاں، مولانا مظہر علی اظہر، جگر مرادآبادی، روش صدیقی احسان دانش، غلام رسول مہر، علامہ اقبال، جیسے آفتاب و ماہتاب کے نام شامل ہیں، جن کے ذکر کے بغیر اس دور کی کوئی سوانحی تاریخ مکمل نہیں کہی جاسکتی۔ پوری کتاب ۲۵ مشاہیر امت کی منہ بولتی قلمی تصویریں ہیں، جن کے خدوخال اور حسن وجمال کی آرائش وزیبائش میں شاہ صاحب کے متین اور سنجیدہ وشگفتہ تجربہ کار و گہربار قلم نے اہم کردار ادا کیا ہے، اسلوب نگارش دلکش، دل نشین اور مصنف کی ذہانت وذکاوت کا آئینہ دار ہے۔ شاہ صاحب کی اپنی زندگی کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ بیجا طریق پر کسی شخصیت سے متاثر نہیں ہوتے اور ان کی نگاہ علم وفضل اور کردار واعمال کے سچے جواہرات کی متلاشی ہے، اپنی زندگی میں جن صاحبانِ کمال سے انھوں نے واقعی طور پر اثر لیا صحیح خطوط کے ساتھ انہی حضرات کے سوانحی خاکے انھوں نے اس کتاب میں جمع کئے ہیں۔ کتاب پڑھتے وقت محسوس ہوتا ہے جیسے کوئی صاف شفاف ندی راستے کے تمام نشیب وفراز طے کرتی ہوئی خرام ناز سے بہہ رہی ہے اور انتہائی دلچسپ ہونے کے باوجود کوئی افسانہ نہیں بلکہ ان کے پچاس سالہ شخصیاتی مطالعہ کا نچوڑ اور عوام وخواص کے دلوں میں کروٹیں بدل بدل کر پیدا ہونے والے درد کی حقیقت افروز کہانی ہے۔

یہ کتاب ادب وشاعری، صحافت وسیاست اور مذہب سے تعلق رکھنے والے باذوق حضرات کے لئے نہ صرف لائق مطالعہ ہے بلکہ ایک قیمتی دستاویز اور گراں قدر تحفہ ہے۔ مجھے امید ہے کہ اس مجموعہ کے بعد شاہ صاحب کے اور ہزاروں مضامین جو سنہ ۱۹۳۵ء سے لے کر تا حال ان کے قلم سے نکلے اور مؤقر اخبارات ورسائل کے ذریعہ ملک میں پھیلے، مرتب ہوکر علمی اور ادبی حلقوں کے سامنے آسکیں گے۔

شاہین جمالی

علامہ انور شاہ کشمیریؒ

خطۂ کشمیر اپنی حسین وگل فروش وادیوں، بہار بہ دامن کوہساروں باصرہ نواز مناظر، خوبصورت چمنستانوں، دل نواز لالہ زاروں، اپنی اونچی اونچی سبزہ فروش پہاڑیوں اور اپنی گہری گہری ترائیوں کے اعتبار ہی سے زمین پر قدرت کی کاریگری اور صناعی کا ایک بے مثال نمونہ نہیں، نہ صرف یہ کہ وہاں قدم قدم پر لالہ وگل کے خزانے بکھرے پڑے ہیں، وہاں کا ہر ذرہ حسن فطرت کا ایک دلآویز شاہکار ہے، زمین کے سینے پر مچل مچل کر چلتے اور بہتے ہوئے سرد و شیریں چشمے، دراز قد اور سڈول جسم کے محبوبوں اور نازنینوں کی طرح تن کر کھڑے ہوئے چنار کے درخت، شراب جوانی کی تندی اور مستی میں بہک بہک کر جھومتے رہنے والے سیب اور خوبانی کے پیڑ، آسمان کی بلندیوں کو بار بار چھوتی رہنے والی پہاڑیوں، حد نظر تک پھیلی ہوئی سبزہ ولالہ و شگوفوں کی چادریں، قدرتی چشموں، بلند آہنگ آبشاروں اور پہاڑوں کی چوٹیوں سے تیزی کے ساتھ نیچے آتے ہوئے دریاؤں کے کنارے پر بیٹھی ہوئی حسین دوشیزاؤں کی آنکھوں میں چمکتی ہوئی نیک دلی کی معصومیت ان کی پیشانیوں کی چاندنی، زلفوں میں بسی ہوئی نکہت، گیسوئے عنبریں میں پڑے ہوئے شکن اور ان کے شباب تازہ وجمال کامل کی مسکراتی ہوئی بہار پھولوں، پھلوں اور میوؤں کی فراوانی، موسم کی خوشگواری، زمین کی قوت نمو ہوا کی تازگی اور لطافت، پانی کی ٹھنڈک اور غذا کی خوش ذائقی اپنا کوئی

جواب نہیں رکھتی۔ نہ صرف یہ کہ وہاں سرد و خنک راتوں میں دور دور تک بچھے ہوئے سبزے کے مخملیں فرشوں پر چاند کی روشنی وہ لطف دیتی ہے کہ سبحان اللہ! پہاڑوں کے پیچھے ڈوبتے ہوئے سورج کا نظارہ، ہنستے ہوئے پھولوں، شرمائی ہوئی کلیوں اور شریر و شوخ شگوفوں کے درمیان ایک عجیب کیفیت پیدا کرتا ہے، بلکہ یہ حقیقت ہے کہ لالہ و گل سے معمور اس جنت بے نظیر میں ردم خیزی اور شخصیت آفرینی کی ایک خاص صلاحیت بھی ہے۔

یہ بتانے کی بات نہیں کہ آب و ہوا کی خوشگواری، موسم کا اعتدال، مناظر کی رنگارنگی، پھلوں اور میوے کے قسم قسم کے ذائقے صرف انسان کے ظاہری حسن و جمال ہی میں اضافہ نہیں کرتے اور صرف وہ انسان کی تندرستی اور صحت جسمانی کے لئے ہی کارآمد نہیں بلکہ وہ صحت مند دماغ، تندرست ذہن، علمی مذاق رکھنے والی طبیعتیں، شاعرانہ مذاق اور صناعی و فنکاری کی صلاحیتوں کو پیدا کرنے، بڑھانے اور نشو و نما دینے میں بھی پوری اعانت کرتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ کشمیر کی سرزمین پر حسن فطرت کے آغوش میں علم و کمال نے آنکھ کھولی، قدرتی چشموں کا ٹھنڈا ٹھنڈا پانی پی کر شاعری اور ادب نے آغوں آغوں کرتے ہوئے صاف بولنا شروع کیا، باد صبا کے بار بار آتے ہوئے جھونکوں سے حکمت و دانائی کے لب بستہ غنچے کھل پڑے اور رنگ برنگ کے پھولوں، ننھی ننھی کلیوں، چھوٹے چھوٹے پودوں اور مہوشان سیم تن کی رگ جسم سے بھی زیادہ باریک شاخوں کی ہم نشینی سے ذکاوت اور ذہانت نے جلاپائی شعرا و ادبا میں غنی کاشمیری، علامہ اقبال، خواجہ عزیز لکھنوی، آغا حشر کاشمیری، پنڈت برجموہن دتاتریہ کیفی، پنڈت رتن ناتھ سرشار، آنند نرائن ملا، مومن خاں مومن۔ ایم اسلم۔ مشہور افسانہ نگار کرشن چندر۔ چراغ حسن حسرت۔ نیاز کاشمیری۔ ظہیر کاشمیری۔ میر غلام رسول نازکی، علامہ حسین میر کاشمیری

منشی محمد الدین فوق۔ ارباب سیاست و حکمت میں پنڈت موتی لال نہرو، پنڈت جواہر لال نہرو۔ ڈاکٹر محمد عالم۔ ڈاکٹر کچلو۔ سر تیج بہادر سپرو۔ شیخ محمد عبداللہ نواب سر سلیم اللہ اور نواب خواجہ حبیب اللہ آف ڈھاکہ۔ مولانا محمد سعید مسعودی، مرحوم بخشی غلام محمد۔ مرحوم خواجہ غلام محمد صادق اور ـ وزیر اعلیٰ کشمیر سید میر قاسم۔ حضرات اہل علم و کمال میں حضرت مولانا سید محمد انور شاہ اور ان کے خاندان کے اور بہت سے علماء نسل اور وطن کے اعتبار سے کشمیر سے قریبی تعلق رکھتے ہیں۔ آج کی صحبت میں ہم کشمیر کے مایۂ ناز فرزند اور عالم اسلام کی مشہور شخصیت، حضرت الاستاذ الامام مولانا سید انور شاہ صاحب کاشمیری کا مختصر تعارف کرا رہے ہیں۔

حضرت مولانا انور شاہ صاحب کا تعلق کشمیر کے ایک قدیم الایام خاندان سے ہے جس کے مورث اعلیٰ بغداد سے پہلے ملتان آئے اور ملتان سے لاہور پہنچے اور لاہور سے کشمیر کی رنگینیوں اور فطری خوبصورتیوں نے انہیں اپنی طرف کھینچ لیا اور یہ خاندان مستقل حیثیت سے کشمیر میں بس گیا۔ مولانا انور شاہ کے خاندان میں علم و فضل اور حکمت و دانائی کے جوہر قدرتی حق کے طور پر تقسیم ہوتے رہے، ان کے آبا و اجداد کی بارہ نسلیں علوم عصریہ میں ممتاز اور عوام و خواص کی عقیدت و محبت کا مرجع بنی رہیں۔ علاقہ لولاب کی تحصیل بارہ مولا کا ایک خاص گاؤں دودھوان ان کا مقام پیدائش ہے، ان کے والد مرحوم کا اسم گرامی مولانا محمد معظم شاہ تھا، جن کے ہزاروں مرید اس علاقہ میں موجود ہیں۔ ۱۲۹۲ھ میں حضرت مولانا انور شاہ کی پیدائش ہوئی، ذہانت و ذکاوت، علم و فضل ان کے گھر کی دولتیں تھیں، لیکن پانچ سال ہی کی عمر میں بڑی توجہ اور نگرانی کے ساتھ ان کی تعلیم شروع کرائی گئی، آٹھ سال کی عمر میں انھوں نے اپنے والد ماجد سے فارسی اور عربی کی کافی تعلیم حاصل کرلی، پھر اپنے شوق سے علاقہ ہزارہ کے پہاڑی علاقہ میں چلے گئے اور وہاں وقت کے مشہور

و مستند علماء سے استفادہ کیا، ابھی ان کی عمر صرف سولہ سترہ سال کی تھی، لیکن وسعت مطالعہ، علمی تبحر، قوت حافظہ، دقیقہ رسی، نکتہ طرازی اور ذہانت و ذکاوت میں وہ اپنی نظیر نہیں رکھتے تھے۔ ان کی ابتدائی زندگی کے حالات ہی نے بتا دیا کہ وہ قریبی عرصہ میں ایک مشہور عالم، دینی رہنما اور مذہبی قائد کی حیثیت سے دور دور تک شہرت پائیں گے۔ ۱۳۰۸ھ میں آپ ہزارہ سے نکل کر پنجاب ہوتے ہوئے یوپی کے مشہور دینی مرکز دارالعلوم دیوبند میں تشریف لائے، یہاں اس وقت ہندوستان کے مشہور زمانہ عالم حضرت مولانا شیخ الہند دیوبندی، حدیث و تفسیر کے اعلیٰ استاذ کی حیثیت سے دارالعلوم میں موجود تھے۔

حضرت مولانا انور شاہ نے انہی کے درس میں شرکت فرمائی، طالب علمانہ حیثیت سے صرف دو سال یہاں آپ کا قیام رہا۔ اور دیوبند سے فارغ ہوکر آپ گنگوہ ضلع سہارنپور میں اس وقت کے مشہور شیخ محدث حضرت مولانا رشید احمد صاحب کے یہاں حاضر ہوئے اور ان سے باطنی علوم کا استفادہ کیا گنگوہ سے آپ دہلی چلے گئے، وہاں اپنے رفیق خاص مولانا مفتی کفایت اللہ دہلوی کی شرکت کار سے کشمیری دروازہ کے باہر مدرسہ امینیہ کے نام سے ایک مدرسہ قائم کیا جو آج تک نہایت وسیع پیمانہ پر علمی خدمات میں مصروف ہے، دہلی میں کئی سال کے قیام کے بعد آپ واپس کشمیر تشریف لے آئے۔ یہاں خواجگان بارہ مولا خصوصاً خواجہ عبدالصمد مرحوم اور خواجہ امیرالدین کے اصرار پر مدرسہ فیض عام کے نام سے ایک علمی درسگاہ کی داغ بیل ڈالی اور کئی سال تک اس درس گاہ میں حدیث و تفسیر کا درس دیا، کشمیر کے اس عرصۂ قیام میں آپ چند مشاہیر کشمیر کے ساتھ حج بیت اللہ اور زیارت نبوی (زادہا اللہ شرفاً و تعظیماً) کے لئے تشریف لے گئے۔ حجاز سے مصر و شام کا سفر اختیار کیا اور ان بلاد اسلامیہ کے تمام علماء و فضلاء سے ملاقاتیں ہوئیں۔

بڑے بڑے کتب خانوں میں ایک عرصہ تک نوادرات علمی کا مطالعہ کرتے رہے
حضرت مولانا انور شاہ حیرت انگیز قوت حافظہ کے مالک تھے، ان کے متعلق
عام طور پر یہ مشہور ہے اور حق یہ ہے کہ اس شہرت میں ذرہ برابر بھی کوئی مبالغہ
نہیں کہ ضخیم سے ضخیم کتابوں کو وہ صرف ایک مرتبہ مطالعہ فرماتے اور ان کے
سارے مضامین، بقید، صفحہ و سطر انھیں برسہا برس تک محفوظ رہتے، یہی
وجہ ہے کہ علمی تبحر اور وسعت مطالعہ میں وہ اپنے وقت میں بے نظیر انسان
اور یگانہ روزگار عالم تسلیم کیے گئے۔ بلاد اسلامیہ کے کتب خانوں سے
آپ نے خود فائدہ اٹھایا اور مصنفین اسلام کا گراں بہا علمی ذخیرہ آپ کے سینے
میں منتقل ہو گیا۔ اس سفر میں جن علماء سے آپ کی ملاقات ہوئی وہ آپ کے
علمی کمالات کے گرویدہ ہو گئے، اور سب نے انھیں روایات حدیث کی
سندات مرحمت فرمائیں جن میں انھیں حضرت العلامۃ الجلیل الاستاذ اور
حضرت العالم الکبیر کے معزز القاب سے خطاب کیا گیا۔ ہندوستان آئے
تو آپ کے استاذ حضرت شیخ الہند، اپنی مشہور سیاسی تحریک "ریشمی خطوط کی
سازش" کے سلسلہ میں حجاز جانے کے لئے تیار تھے اور چاہتے تھے کہ دارالعلوم
دیوبند میں ان کی علمی ذمہ داریاں حضرت مولانا محمد انور شاہ قبول فرمالیں
باوجودیکہ حضرت شیخ الہند صاحب کے دوسرے ممتاز شاگرد مولانا عبید اللہ
سندھی۔ مولانا حسین احمد صاحب مدنی، مولانا شبیر احمد عثمانی، مولانا مفتی
کفایت اللہ، مولانا سجاد بہاری بھی اس وقت موجود تھے مگر استاذ کی
علمی جانشینی کا فخر مولانا انور شاہ کو حاصل ہوا اور آپ استاذ کی ایما و
ارشاد پر ایشیار کی مشہور علمی جامعہ دار العلوم الاسلامیہ دیوبند کے امیر
الجامعہ مقرر ہوئے، کم از کم بیس سال تک آپ نے دار العلوم میں قیام
فرمایا، یہاں حدیث و تفسیر اور دوسرے علوم و فنون کی انتہائی کتابیں
آپ کے زیر درس رہیں۔ آپ علمی حلقوں میں ایک "چلتا پھرتا کتب خانہ"

کے نام سے مشہور تھے، انگریزی داں حضرات علوم عربیہ ودینیہ کے شائق بڑے بڑے علماء وفضلاء، کالجوں کے پروفیسر آپ کی خدمت میں حاضر ہوتے اور ان سے علمی رہنمائی حاصل کرتے، آپ کی قوت حافظہ کا یہ عالم تھا کہ کبھی کسی علمی سوال کے جواب میں کتاب دیکھ کر جواب دینے کی ضرورت پیش نہیں آئی۔ دیوبند میں آپ کا وجود اسلامی علم وحکمت کی گہرائیوں اور پہنائیوں کا ایک حیرت انگیز نمونہ تھا، نہ صرف ہندوستان بلکہ دوسرے ممالک کے اہل علم آپ کے پاس آتے اور گوہر مراد سے اپنا دامن بھر کر لے جاتے تھے۔ ایشیا کے مشہور حکیم وشاعر علامہ اقبال کو حضرت مولانا سید انورشاہ سے نیازمندانہ خصوصیت حاصل تھی اور اقبال کے اکثر علمی افکار ونظریات علامہ انورشاہ کے فیضانِ نظر کا کرشمہ تھے، علامہ اقبال مولانا انورشاہ کو اپنا روحانی رہنما تسلیم کرتے تھے، مدراس یونیورسٹی میں علامہ اقبال نے جو تحریری خطبات دیئے اور اب جو انگریزی اور اردو میں چھپ کر شائع ہو چکے ہیں ان کے شروع میں علامہ اقبال نے اعتراف کیا ہے کہ انھوں نے تمام دینی علوم میں براہ راست مولانا انورشاہ سے فائدہ اٹھایا ہے، علامہ اقبال ہمیشہ مولانا انورشاہ کے سامنے ادب واحترام کے ساتھ بیٹھتے تھے، ایک عرصہ تک وہ اس کی کوشش کرتے رہے کہ مولانا انورشاہ کو دیوبند سے لاہور بلالیں اور لاہور میں ایک عظیم الشان اسلامی جامعہ قائم کی جائے جس کے شیخ الجامعہ اور استاذ خاص مولانا انورشاہ ہوں۔ مولانا ابوالکلام وقت کے کسی عالم فاضل سے اتنے متاثر نہیں تھے جتنے مولانا انورشاہ سے، بار بار انھوں نے اپنی نجی مجلسوں میں مولانا انورشاہ کی بے نظیر علمی استعداد کا اعتراف کیا، مولانا سید سلیمان ندوی نے مولانا انورشاہ کے انتقال پر "وفیات" کے سلسلہ میں اپنے رسالہ "معارف" میں جو مضمون لکھا تھا اس کا ایک خاص جملہ قریب یوں تھا کہ

"وہ علم کے ایک ناپیدا کنار دریا کی حیثیت رکھتے تھے مگر ایسا دریا

جس کی سطح بالکل ساکن ہو اور اس کے اندر موتی و جواہر پڑے پڑے ہوں "

رئیس الاحرار مولانا محمد علی، مولانا انور شاہ سے خاص عقیدت رکھتے تھے، جب سامنے آتے تو جھک کر ملتے اور ان کی مجلس میں کان لگا کر سنتے، علی ہذا القیاس ڈاکٹر انصاری مرحوم، مولانا عبید اللہ سندھی، مولانا حسین احمد صاحب مدنی، مولانا اشرف علی صاحب تھانوی، مولانا شبیر احمد عثمانی، مولانا مفتی کفایت اللہ، مولانا عبد الباری فرنگی محلی، مولوی عبد الماجد دریابادی، مولانا ظفر علی خاں اور بلاد اسلامیہ کے علماء میں سید رشید رضا مرحوم، علامہ زاہد کوثری، محب الدین الخطیب، ڈاکٹر طٰہٰ حسین وغیرہ آپ کے علمی کمالات کے ثنا خواں تھے۔

مصر کے مشہور عالم سید رشید رضا ۱۳۳۰ھ میں دیوبند تشریف لائے یہاں ایک جلسہ میں آپ نے عربی زبان میں مولانا انور شاہ کی تقریر سنی تو فرمایا کہ میں اگر ہندوستان کے سفر میں دیوبند نہ آتا تو ہندوستان سے مایوس لوٹتا پھر مصر واپس جا کر اپنے مشہور رسالہ "المنار" میں مولانا انور شاہ کے علم و فضل پر مستقل مضامین لکھے۔ حضرت مولانا انور شاہ تقریباً ۲۰ سال تک دار العلوم دیوبند میں درس و تدریس اور تصنیف و تالیف کا کام کرتے رہے، اخیر عمر میں ۶ سال ہندوستان کی ایک اور مشہور اسلامی درس گاہ میں آپ کا قیام رہا۔ یہاں آپ نے ایک علمی ادارہ قائم فرمایا تھا جو اب تک علمی تصانیف کو بہترین طباعت و اشاعت کے ساتھ چھاپنے کا کام کر رہا ہے، اس ادارہ سے خود حضرت شاہ صاحبؒ اور دوسرے بزرگوں کی نادر الوجود کتابیں چھپ کر مصر و شام اور ترکی و عراق تک پہنچ چکی ہیں مولانا انور شاہ کے شاگردوں کا حلقہ تقریباً چار ہزار افراد پر مشتمل ہے، جن میں مولانا مناظر حسن گیلانی، مولانا بدر عالم میرٹھی، مولانا حفظ الرحمٰن سہاروی، مولانا سعید احمد اکبر آبادی سابق پرنسپل مدرسہ عالیہ کلکتہ، مولانا اعزاز علی ناظم تعلیمات دار العلوم دیوبند، مولانا منظور نعمانی ایڈیٹر رسالہ "الفرقان"

شمس العلماء، علامہ تاجور نجیب آبادی، مولانا محمد یوسف بنوری استاذ جامعہ ڈابھیل
مولانا محمد میاں صاحب سابق ناظم جمعیۃ علماء ہند، مولانا قاری محمد طیب مہتمم
دار العلوم دیوبند، مولانا مفتی محمد شفیع دیوبندی، مولانا محمد ادریس کاندھلوی شارح
مشکوٰۃ شریف، خواجہ عبد الحی فاروقی استاذ جامعہ طبیہ دہلی، قاضی زین العابدین
سجاد میرٹھی، مولانا حامد الانصاری غازی، مولانا مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی ناظم
ندوۃ المصنفین دہلی، مولانا فخر الدین صاحب صدر جامعہ شاہی مراد آباد، مولانا
کریم بخش صاحب صدر شعبۂ عربی گورنمنٹ کالج لاہور، مولانا انوار الحق العلوی
پروفیسر اورینٹل کالج لاہور، مولانا یعقوب الرحمٰن عثمانی لکچرار عثمانیہ یونیورسٹی
حیدر آباد، حضرت مولانا محمد یوسف میر واعظ کشمیر، مولانا میر شاہ صاحب
کشمیری، مولانا سید محمد ادریس سکھر وڈوی، مولانا محمد صدیق نجیب آبادی،
مولانا شاہ عبد القادر رائے پوری، مولانا شائق احمد عثمانی ایڈیٹر "عصر جدید"
مولانا مفتی محمود احمد نانوتوی، مولانا عبد الوحید صدیقی ایڈیٹر نئی دنیا دہلی
قابلِ ذکر ہیں۔

حضرت شاہ صاحب کو سیاسیات سے بھی گہرا تعلق تھا جمعیۃ علماء ہند
کے اجلاس پشاور منعقدہ ۱۳۴۵ھ کی آپ نے صدارت فرمائی اور عالمانہ
خطبہ ارشاد فرمایا، جمعیۃ علماء ہند کے آپ ہمیشہ ہمدرد اور سرپرست رہے
مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی، سید عطاء اللہ شاہ بخاری، مولانا حفظ الرحمٰن
مولانا عبد الحنان ہزاروی، مولانا غلام غوث سرحدی آپ کے خاص شاگردوں
میں سے تھے اور آپ ہی کے ارشاد پر یہ حضرات سیاسیات میں شریک ہوئے
تحریک حریت کشمیر سے بھی حضرت ممدوح کو خاص دلچسپی تھی، جب کبھی
آپ اپنے وطن کشمیر تشریف لاتے تو اس تحریک آزادی کے علمبرداروں سے
اپنی ہمدردی اور وابستگی کا اظہار فرماتے، مولانا محمد سعید صاحب مسعودی سابق
ممبر پارلیمنٹ آپ ہی کے خاندان کے ایک ممتاز فرد ہیں اور مولانا محمد سعید مسعودی

کے واسطے سے قائد کشمیر شیخ محمد عبد اللہ نے بھی ایک دفعہ حضرت مرحوم سے خط و کتابت فرمائی تھی۔

حضرت شاہ صاحب نے کئی سال مرض بواسیر میں مبتلا رہ کر ۳ صفر ۱۳۵۲ھ دسمبر ۱۹۳۳ء کو دیوبند میں انتقال فرمایا، آپ کے انتقال پر سارے ملک میں ماتم کیا گیا، بلاد اسلامیہ کے مذہبی اور دینی عمائدین نے بھی آپ کے وفات کے صدمہ کو محسوس کیا، ملکی اور غیر ملکی اخبارات میں دیر تک آپ کے حالات زندگی اور آپ کے علم و فضل پر تبصرے شائع ہوتے رہے، کشمیر میں آپ کا خاندان ابھی تک موجود ہے، حضرت شاہ صاحب عربی و فارسی کے بلند پایہ شاعر بھی تھے آپ کا بہت سا کلام شائع ہو چکا ہے۔

عادت و خصلت کے لحاظ سے وہ بہت متقی، دیانتدار، بلند نظر، منکسر المزاج اور تنہائی پسند انسان تھے۔ نگارستان کشمیر کے مصنف نے لکھا ہے کہ بے حد قلیل النوم اور قلیل الغذا تھے، ان کی طبیعت کا تحمل، فطری نیکی اور پختہ کردار قابل قدر اور دوسروں کے لئے قابل عمل تھے، بہت سی ریاستوں اور بڑی بڑی انگریزی یونیورسٹیوں نے انھیں بار بار بڑے بڑے مشاہروں پر اپنے یہاں بلانے کی سرگرم سعی کی مگر انھوں نے کبھی بڑی تنخواہ کا لالچ نہیں کیا، نظام حیدرآباد ان کے خاص قدرداں تھے، والیٔ ریاست بھوپال نے انھیں اپنی ریاست میں بلایا مگر یہ حصول منفعت کے لئے کبھی ان ریاستوں میں نہیں گئے اور نہ ان رؤسا کا تقرب پسند کیا۔ کشمیر جنت نظیر کو بجا طور پر یہ فخر ہو سکتا ہے کہ اس دور آخر کا سب سے بڑا محدث، عالم اور فاضل اس کے فردوسی لالہ زاروں اور خوبصورت مرغزاروں کا ایک تر و تازہ پھول تھا۔

حضرت مولانا عثمانی

۶؍ اگست ۱۹۴۷ء (مطابق ۱۸؍ رمضان ۱۳۶۶ھ) کی دوپہر کو جب حضرت مولانا عثمانی دیوبند سے کراچی کے لئے روانہ ہوئے تو اس وقت کسی کو بھی یہ خیال نہیں تھا کہ حضرت مولانا آخری بار دیوبند سے جارہے ہیں اور اب دیوبند کو ان کی صورت دیکھنی نصیب نہیں ہوگی، اس وقت مولانا افتتاح پاکستان کی تقریبات اور وہاں کی دستور ساز اسمبلی کے جلسوں میں شرکت کے لئے تشریف لے گئے تھے زیادہ سے زیادہ پندرہ دن میں واپسی کی توقع تھی، پنجاب اگرچہ اس وقت بھی فسادات کا جہنم بنا ہوا تھا اور پنجاب کے پانچوں دریاؤں میں پانی کی جگہ انسانی خون کی روانی تھی، لیکن جو کچھ حالات اس کے بعد پیش آئے، ۶؍ اگست کو حضرت مولانا کی روانگی کے وقت انسانی ذہن ان کی خوفناکی سے بالکل بے خبر تھا، اسی دن صبح سویرے سے میں دارالعلوم کے دفتر اہتمام میں کاموں کے ہجوم میں گھرا ہوا تھا، بار بار حضرت مولانا کی خدمت میں حاضری کا خیال آتا، مگر کاغذوں کا ڈھیر سامنے تھا اور انہیں جوں کا توں چھوڑ کر اٹھنا مشکل، گیارہ بجے میں اس خیال سے تیز تیز دفتر اہتمام کے زینے سے اترا کہ گاڑی کا وقت اگرچہ قریب ہے لیکن شاید تشریف نہ لے گئے ہوں اور مجھے ملاقات کا موقع مل جائے۔ دارالعلوم کے بالکل متصل حضرت مولانا کا مکان تھا، وہاں پہنچا تو معلوم ہوا کہ مولانا کو گئے ہوئے دیر ہوگئی ہے اور اب تو اتنا وقت گذر چکا ہے کہ ریل گاڑی ضرور چھوٹ گئی ہوگی، ظاہر صورت میں یہ بات بہت بڑی نہیں تھی، زندگی میں خبر نہیں کتنی دفعہ ایسا ہوا ہوگا کہ مولانا سفر پر تشریف لے گئے اور ہم نے روانگی کے وقت ملاقات کی ضرورت محسوس نہ کی،

اور اگر کسی اور کسی عذر کی بنا پر ملاقات نہ ہوئی تو اس کا کوئی افسوس نہیں ہوا، لیکن خدا گواہ ہے کہ اس دن ملاقات سے محرومی پر دل میں ایک ملال اور طبیعت پر اداسی طاری تھی۔ میں مولانا کے مکان سے واپس آرہا تھا مگر میرے قدموں میں سکت نہیں تھی اور پاؤں ٹوٹتے ہوئے معلوم ہوتے تھے۔

۱۴ ردسمبر ۱۹۴۹ء کی صبح کو جب مجھے حضرت مولانا کے حادثۂ رحلت کی اطلاع ملی تو ذہن میں بیساختہ دو سال پہلے کا ایک واقعہ تازہ ہوگیا، اور خیال آیا کہ اس وقت کی محرومی عارضی اور وقتی نہیں بلکہ دائمی تھی، دماغ نے اگرچہ اس وقت آنے والی حرماں نصیبی کا ادراک نہیں کیا تھا مگر دل کا تحسر و تاسف بے وجہ نہیں تھا۔

راقم الحروف اپنی زندگی کے چودہ پندرہ سال حضرت مولانا کے زیر قدم گذار چکا ہے، جامعہ ڈابھیل میں میرا بچپن حضرت مولانا کی بزرگانہ شفقت میں بسر ہوا اور اس کے بعد چھ سات سال دیوبند میں میری لاتعداد صبحیں اور شامیں مولانا کی خدمت میں گذریں۔

اہل پاکستان اپنے شیخ الاسلام اور مذہبی قائد کے انتقال پر افسوس کرتے ہوں گے، یہاں ہندوستان میں ان کے لاکھوں نیازمند جماعت دیوبند کے سب سے بڑے عالم کی جدائی پر غمزدہ ہیں۔

سیاسی اختلافات کے باوجود کوئی نہیں جس نے دکھے ہوئے دل سے مولانا کی وفات کی خبر نہ سنی ہو۔ مولانا حفظ الرحمٰن صاحب سیوہاروی ناظم جمعیۃ علماء ہند سے مولانا عثمانی کا سیاسی اختلاف کسی تفصیل کا محتاج نہیں، یوں سمجھئے کہ یہ دونوں بزرگ فکر و نظر کے اختلافات کی آخری حدوں تک پہنچے ہوئے تھے، لیکن ۱۴ ردسمبر کی صبح کو ابھی سورج نے منہ نہیں نکالا تھا کہ دارالعلوم کے دفتر اہتمام میں فون کی گھنٹی بجی، قریب میں بیٹھے ہوئے ایک صاحب نے فون پر کان لگائے اور پوچھا کہ :-

"آپ کہاں سے بول رہے ہیں؟"

"حفظ الرحمٰن۔ دفتر جمعیۃ العلماء دہلی"

"مولانا کیا حکم ہے؟"

"بھئی مہتمم صاحب دفتر میں موجود ہیں یا نہیں؟"

"مولانا! مہتمم صاحب یہاں تشریف نہیں رکھتے، آپ فرمائیں تو انھیں بلا لیا جائے۔"

فون پر کچھ دیر تک خاموشی، پھر مولانا حفظ الرحمٰن نے رُک رُک کر کہا۔

"آپ کو معلوم ہے کہ رات بھاولپور سے مولانا عثمانی کی وفات کی خبر آئی ہے۔ جی مولانا عثمانی۔ استاذ محترم مولانا عثمانی کی۔ یہ خبر دارالعلوم میں پہنچ چکی ہے یا نہیں؟"

ادھر سے جواب میں کہا گیا کہ رات ہی یہ خبر یہاں آ چکی ہے اور اب فجر کی نماز کے بعد سے دارالعلوم کے تمام اساتذہ اور طلباء نودرہ کی عمارت میں جمع ہیں اور مولانا کے ایصالِ ثواب کے لئے قرآن شریف پڑھ رہے ہیں"

مولانا حفظ الرحمٰن نے کہا کہ ٹھیک ہے، بس مجھے یہی کہنا تھا۔

جن صاحب نے فون پر مولانا حفظ الرحمٰن سے بات چیت کی وہ اٹھ کر میرے پاس آئے، کہنے لگے کہ رنج و غم بڑے بہادروں اور قادر الکلام خطیبوں کی زبان پر بھی تالا لگا دیتا ہے، مولانا حفظ الرحمٰن کے لہجہ میں اس وقت سوگواری، ماتم، آہ و بکا اور گریہ و زاری کے سوا اور کچھ نہیں تھا، میں تھوڑی دیر بعد دفتر اہتمام سے نیچے نودرہ میں گیا، تو مولانا حسین احمد مدنی، مولانا محمد طیب اور دارالعلوم کے دوسرے اساتذہ قرآن خوانی کے بعد عمارت سے باہر نکل رہے تھے، اس وقت ان سب کے چہرے اُداس، نگاہیں متحیر اور غم و الم کے احساسات ان کی پیشانیوں پر بول رہے تھے۔ میں پلٹ کر دوسرے زینہ سے دفتر اہتمام میں آنے لگا تو درمیان میں دارالحدیث کی

بالائی منزل کی لمبی چوڑی گیلری سے گذرا، دار العلوم میں یہ وہ جگہ ہے جہاں خبر نہیں مولانا عثمانی کتنی دفعہ تقریر کر چکے ہیں، گیلری سے گذرتے ہوئے مجھے دار الحدیث سے صاف آواز سنائی دی کہ :-

"سکون و راحت، انسانی زندگی کے سب سے بڑے دشمن ہیں ممکن ہے کہ سانپ انسان کا سب سے بڑا دشمن ہوتے ہوئے بھی کسی وقت انسان سے اچھا سلوک کرنے اور اسے کاٹ لینے سے رک جائے، ایسا ہو سکتا ہے کہ زہر انسان پر اثر نہ کرے اور انسان زہر کھا لینے کے بعد بھی زندہ رہے مگر ایسا نہیں ہو سکتا کہ جو قوم اور جو طبقہ تن آسانی اور راحت پسندی کا خوگر ہو جائے اور جہد و کشمکش سے جان چرانے لگے اسے قدرت عزت کی کوئی زندگی اور زندگی کا کوئی ایک لمحہ بھی عنایت فرما دے، عیش طلبی اور انسانی زندگی کا باہم کوئی تعلق نہیں۔ زندگی میں عیش کا تصور و تلاش، انسان کیلئے ایک لاعلاج مرض ہے اور عیش و راحت کی موجودگی انسانیت کے ناموس و عزت کے لئے موت کا پیغام ہے!"

"ہاں بھائی ازہر میاں نے تو ابھی اکبر الہ آبادی کو بنیا اور اس کی شاعری کو بنیا پن کہا ہے مگر مجھے تو ہمیشہ سے اکبر کی شاعری سے اُنس رہا ہے۔ سبحان اللہ اس موضوع پر اس نے کیسی اچھی بات کہی ہے (مولانا نے مجمع پر ایک تیز نظر ڈالی پھر بھاری اور پُر شکوہ آواز میں فرمایا کہ) ؎

ہر چند بگولا مضطر ہے اک جوش تو اس کے اندر ہے
اک رقص تو ہے، اک وجد تو ہے، بےچین سہی، برباد سہی

دار الحدیث کی گیلری سے گذرتے ہوئے اس وقت مولانا کے یہ الفاظ

میرے کانوں میں گونج رہے تھے، یہ صرف محویت تصوّر کا ایک کرشمہ تھا ورنہ یہاں دارالحدیث میں اب کہاں مولانا شبیر احمد عثمانی اور کہاں ان کی تقریر؟ کئی سال کی بات ہے عشاء کے بعد یہاں دارالحدیث میں جلسہ تھا اور ہزار دس آدمی مولانا عثمانی کی تقریر سننے کے لئے جمع تھے، ان کی تقریر سے پہلے میں نے کوئی مضمون پڑھا اور اس میں کسی موقع پر کہدیا کہ مجھے اکبر کی شاعری بالکل پسند نہیں، اس کی شاعری، شاعری کیا، بنیاپن ہے بس ہر وقت سود وزیاں اور نفع نقصان کے چکر میں رہتا ہے، اکبر کی شاعری میں شاعرانہ جذبات تو اتنے بھی نہیں ہیں جتنی اڑ دیر سفیدی، بوڑھوں کی طرح ہر وقت نصیحتیں، ہر وقت وعظ وتذکیر اور ہر وقت زجر وتوبیخ، میرے اس جملہ پر مولانا نے بعد میں اپنی تقریر میں یہ لفظ کہے۔

دل تصورات کی دنیا میں ڈوب گیا، ڈابھیل اور دیوبند کی زندگی کا ایک ایک منظر سامنے آتا گیا اور میں دیر تک محو خیال رہا، کبھی مولانا کی تقریر اور گفتگو کا انداز یاد آتا، کبھی ان کے مطالعہ اور کتب بینی کی باد آتی، کبھی ان کی نزاکت مزاج، نیک طبعی، ذہانت وذکاوت اور دور اندیشی کے واقعات تازہ ہوتے، کبھی ان کی ناراضگی اور خفگی آنکھوں میں پھرنے لگتی اور کبھی انکی محبت وشفقت اور بزرگانہ سرپرستی ونگرانی کا خیال آتا، اپنے سب چھوٹوں پر اُن کی شفقت کا خاص انداز تھا، پھر مجھ سے تو والد محترم حضرت العلامہ محمد انور شاہ رحمۃ اللہ علیہ کے علمی رشتوں کی بنا پر انھیں جو تعلق تھا وہ ناقابل بیان ہے، ہائے ان کی محبت وشفقت، حوصلہ افزائی اور قدردانی کا کیا عالم تھا، حضرت مولانا سامنے چارپائی پر لیٹے ہوئے ہیں، میں نیچے فرش پر بیٹھا ہوں، میرے پیچھے اور بہت سے نیازمند ہیں، حضرت مولانا کے چہرے پر تبسم ہے فرمانے لگے۔ ازہر میاں! ابھی ڈاک کا کام تو تمہارے ہی سپرد ہے، آٹھ دس دن سے تم نہیں آئے، بس ساری ڈاک اسی طرح

رکھی ہوئی ہے، میاں دو چار ضروری خط ہیں انھیں کھولو! میں نے قلم سنبھالا اور حضرت مولانا نے اپنے خاص دوست مولانا عبدالماجد دریا بادی کے نام خط کا خلاصہ بولنا شروع کیا۔ خطوط میں ان کی عادت تھی کہ املا نہیں فرماتے تھے کہ وہ حرف بحرف بول رہے ہوں اور لکھنے والا ساتھ ساتھ لکھتا جاتا ہو، شروع میں چند لفظوں میں اشارے فرما دیتے تھے، لکھنے والے کو اپنے ہی سلیقہ سے ان اشارات کو پھیلا کر لکھنے کی ضرورت ہوتی تھی، پھر خط کی کوئی لکیر ٹیڑھی نہ ہو، ایک ایک حرف موتی کی طرح صاف نظر آئے۔ القاب و آداب اور انداز خطاب میں فرق مراتب کا پورا لحاظ کیا جائے، انھیں بے وجہ کی طوالت سے بھی نفرت تھی اور تعقید و ابہام کو بھی ناپسند فرماتے تھے، غرض یہ کہ تحریر کے نقطہ نقطہ پر نظر تھی، میں نے ان کے بتائے ہوئے اشاروں سے پورا خط مرتب کیا اور پڑھ کر سنایا، مسکراہٹ چہرے پر پھیل گئی، فرمانے لگے ماشاء اللہ لکھنے کا خوب سلیقہ ہے، بھئی تمہاری وجہ سے مجھے بڑی راحت ہے، چند لفظ بتا دیتا ہوں تم اُن سے اصل منشاء کو پہنچ جاتے ہو اور اپنے لفظوں میں بات پوری ادا کر دیتے ہو۔

ڈابھیل میں ایک دفعہ حضرت مولانا بیمار تھے، شدید بخار تھا اور غفلت سی طاری تھی، میں نے چارپائی کے پچھلے حصہ سے اوپر چڑھ کر ٹانگیں دابنی شروع کر دیں، چند ہی منٹ گذرے تھے کہ مولانا چونک اٹھے، فرمانے لگے کہ کون ہے؟ کسی نے کہا کہ ازہر! تیزی سے میرا ہاتھ پکڑ لیا، دلگیر لہجہ میں فرمانے لگے، ازہر! تم شاہ صاحب کی یادگار ہو، تم بچہ ہو نہیں جانتے کہ تمہارے ساتھ میرا کیا تعلق ہے۔ میں تم سے یہ خدمت نہیں لے سکتا، اٹھو دوسری چارپائی پر جا کر بیٹھو۔

علم و فضل، قرآن و حدیث کی وسیع معلومات اور علوم عصریہ کی ٹھوس استعداد تو ان کی عالمانہ زندگی کا امتیاز تھا، لیکن حق پسندی اور حق کے

اظہار کی جرأت بھی مولانا کا خاص حصہ تھی، ان کی زندگی میں ان کی حق پسندی کی سینکڑوں مثالیں موجود ہیں۔

جس بات کو سچ سمجھا اس کے اظہار میں کبھی اپنے بیگانہ کی تمیز نہیں کی دوست احباب بگڑ گئے، نیاز مندوں کو گرانی ہوئی، ساتھیوں کے دل غبار آلود ہو گئے مگر حق کے لئے مولانا کو یہ سب کچھ گوارا تھا، مسلم لیگ کی حمایت میں اوّل اوّل جب انھوں نے زبان کھولی تو دل کی بات یہ ہے کہ مجھے مولانا کی یہ سیاسی زندگی ناپسند تھی، میرے نزدیک سیاست کا خارزار مولانا کے لئے تکلیف دہ تھا، اسی لئے دوستوں کی اس بڑی جماعت سے مجھے ناراضگی تھی جو مولانا کو لیگ سے قریب کرنے میں ساعی تھے، مولانا میری منشاء کو پا گئے۔ ایک دفعہ مجھے سمجھانے کی کوشش بھی کی، لیکن جب جان گئے کہ میں بھی اپنے خیالات پر پختہ ہوں تو پھر کبھی تعارض نہ فرمایا لیگ کے سلسلہ میں بہت سی باتیں ہم سے فرماتے تھے اور میں ان میں سے بہت تھوڑے حصہ کی تائید کرتا تھا، مگر اس پر کبھی ناراض نہیں ہوئے اور کبھی بے توجہی اختیار نہیں فرمائی۔

میں ۱۹۴۳ء میں دارالعلوم میں ملازم تھا اور مولانا شبیر احمد صاحب اور مولانا محمد طیب کے پاس ہی کام کرتا تھا، انتظامی معاملات میں مولانا عثمانی صاحب کو ذمہ داران دارالعلوم سے اختلاف پیدا ہوا تو میرا دل بھی انہی کی طرف جھک گیا، باوجودیکہ مولانا محمد طیب صاحب سے بھی میرا تعلق کم نہیں تھا مگر میرے خیال میں اس وقت مولانا عثمانی حق پر تھے اور مظلوم تھے، دو چار ہفتہ کی اندرونی کش مکش کے بعد میں نے مولانا عثمانی سے عرض کیا کہ مولانا میرا مدرسہ میں جی نہیں لگتا اور ان معاملات کی وجہ سے مجھے بہت ضیق پیش آرہی ہے، مجھے آپ اجازت دیں کہ میں مدرسہ سے استعفاء دے دوں، سختی کے ساتھ منع فرمایا۔

کہنے لگے کہ اب تم بچے نہیں رہے ہو، اپنی ذمہ داریوں کو سمجھو، اہل وعیال اور بہن بھائی کا ساتھ ہے، کام نہیں کروگے تو ضروریات کیسے پوری ہوں گی مدرسے سے استعفا ہرگز نہ دینا، یہ عارضی اختلافات ہیں، مستقبل قریب ہی میں سب معاملات درست ہوجائیں گے، پھر اسی دن گھر کی خادمہ کو میری والدہ کے پاس بھیجا کہ ازہر ایسا ارادہ کرتا ہے اسے اس ارادے سے روکو میں نے اسی دن شام کو مدرسہ میں تحریراً استعفا بھیجدی اور کئی دن تک مولانا کے پاس بھی نہیں گیا، لیکن جب گیا تو مولانا کو ناراض پایا۔

علم وفضل، ذہانت وذکاوت، حاضر دماغی، وسعت مطالعہ، دوراندیشی قوت بیان اور قوت استدلال، زہد وتقویٰ، اور عبادت وریاضت، سیاسی بصیرت اور طبیعت کی نکتہ آفرینی، یہ ان کی زندگی کے خاص نقاط ہیں جن پر سینکڑوں صفحے لکھے جاسکتے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ انھوں نے ایک عالم وفاضل ایک سنجیدہ ترین انسان اور ایک شیوا بیان خطیب کی حیثیت سے اپنے معاصرین پر زبردست فوقیت حاصل کی تھی۔ آج ملک وبیرون ملک میں ہزاروں ان کے شاگرد موجود ہیں، لاکھوں ان کے عقیدتمند ہیں اور ان کے علم وفضل کی شہرت عام ہے، حقیقت یہ ہے کہ پاکستان کو دیر سویر سے دستور ساز اسمبلی کا کوئی ممبر بھی میسر آجائے گا، اور وہاں شیخ الاسلام کا منصب خالی نہیں رہے گا، قومی اور مذہبی اجتماعات کے لئے بڑے سے بڑے کسی خطیب کا میسر آنا بھی ناممکن نہیں، علمی درسگاہوں کو متبحر عالم بھی مل سکتے ہیں، اور کتابیں لکھنے والے مصنفین کا وجود بھی عنقا نہیں، لیکن ہمیں نہ اب مولٰنا شبیر احمد عثمانی حاصل ہوسکتے ہیں اور نہ ہم ان کی مخصوص شفقت، محبت حوصلہ افزائی، قدردانی، بزرگانہ عنایتوں اور مربیانہ سلوک کا کوئی بدل پاسکتے ہیں۔ میں نے مولانا مرحوم کی تعزیت کے لئے اخی المعظم مولانا محمد یحییٰ صاحب کو جو خط لکھا اس میں شاید یہ بھی ایک جملہ تھا کہ:۔

"میری طرف سے محترمہ چچی صاحبہ، بالوجی اور اپنی اہلیہ محترمہ کی خدمت میں تعزیت مسنونہ پیش فرما دیجیے، مولانا کے حادثۂ رحلت کے غم سے یہ سب حضرات ضرور نڈھال ہوں گے لیکن ان کے بہت سے نیازمند ایسے بھی ہیں جنھیں ان کے انتقال کے صدمہ کے ساتھ اپنی بہت سی حرماں نصیبیوں کا بھی شکوہ ہے۔"

اور مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی نے اپنے پیام تعزیت میں یہ بات کھول کر بیان کر دی کہ :-

"ہمیں کیا معلوم تھا کہ سیاسی تفرقات ہمیں ایک دوسرے سے اتنا دور کر دیں گے کہ ہم ان کے جنازے میں بھی شریک نہ ہو سکیں گے۔"

مولانا حبیب الرحمٰن کے اس جملہ میں بہت سی حسرتوں کا خون اور بہت سے ارادوں کی ناتمامی کا ملال پوشیدہ ہے، دیوبند سے مولانا شبیر احمدؒ صاحب کو گئے ہوئے دو سال اور کچھ مہینے گذر رہے تھے، ان کے دولت کدہ پر اگرچہ دوسروں کا قبضہ تھا، اور مولانا یہاں موجود نہیں تھے مگر مجھے ان کا مکان انہی سے آباد نظر آتا تھا۔

۱۴ دسمبر کی صبح کو معلوم ہوا کہ ان کا مکان اور ہمارے قلوب سب تاریک ہو چکے ہیں۔ ایک گہری لامتناہی اور طویل تاریکی، ایسی دہشتناک تاریکی جس کے آخیر میں کوئی روشنی نہیں، ایسی شام فرقت جس کی کوئی صبح نہیں اور ایسی غلیظ اندھیاریاں کہ اُن کے دامن میں اُجالے کی کوئی ہلکی سی نمود بھی نہیں، ہائے فانی ؎

جو غم بے اثر نہ ہو، جو شب بے سحر نہ ہو
وہ غم انتظار کیا، وہ شب انتظار کیا؟

مولانا عبید اللہ سندھی

حضرت مولانا عبید اللہ سندھی ایک مشہور مجاہد اور مفکر تھے، ملک کی آزادی کی تحریک میں ان کی خدمات ناقابلِ فراموش ہیں ۱۹۱۵ء میں وہ "ریشمی خطوط" کی مشہور سازش کے سلسلہ میں ہندوستان سے نکلے اور ان کے استاذ حضرت شیخ الہندؒ نے انھیں ایک خاص مشن پر کابل بھیجا تھا، کابل میں سات آٹھ سال تک مولانا کا قیام رہا اور شاہ امان اللہ اور ان کے والد شاہ حبیب اللہ سے ان کے خاص تعلقات تھے، افغانستان کی اس وقت کی سیاست پر مولانا کے فکر او رائے کا زبردست اثر تھا۔ امان اللہ خاں نے تو اپنی زندگی کے کئی بڑے معرکے مولانا کی زیرِ ہدایت انجام کو پہنچائے، مولانا کابل سے نکل کر روس اور ترکی پہنچے، ان دونوں ممالک کے سیاسی انقلاب مولانا کی نگاہوں کے سامنے گذرے، اور دونوں ملکوں کے اربابِ سیاست پر مولانا کی عظمت کا خاص اثر تھا، آخر میں بارہ سال ممدوح نے مکہ مکرمہ میں گذارے اور اس طرح ۲۵ سال کی لمبی جلا وطنی کے بعد ۱۹۳۹ء میں مولانا کانگریسی وزارتوں کی خاص تحریک پر ہندوستان واپس آئے اور ہمیں ان سے ملاقات کی عزت حاصل ہوئی۔

مولانا ایک سکھ خاندان کے چشم و چراغ تھے، لیکن اوائل عمر میں مسلمان ہو گئے اور حضرت شیخ الہند کے پاس علم حاصل کرنے کے لئے دیوبند آئے دیوبند میں حضرت شیخ الہند آپ کے استاد تھے، مولانا سید انور شاہ کاشمیری، مولانا مفتی کفایت اللہ دہلوی، مولانا حسین احمد مدنی، مولانا شبیر احمد عثمانی آپ کے مدرسہ کے ساتھی تھے، دیوبند میں کئی سال تعلیم کے سلسلہ میں آپ مقیم رہے، پھر سندھ چلے گئے، وہاں ایک مدرسہ قائم کیا، رسالہ نکالا، پریس نصب کیا، کتابیں لکھیں اور اپنے فکر پر طلباء کو ڈھالتے رہے، ایک خاص موقعہ پر ان کے استاد حضرت شیخ الہندؒ نے جو اپنے زمانے میں برطانوی حکومت کے خلاف ایک مجاہدانہ تحریک کے علمبردار تھے اور مہاتما گاندھی، مولانا محمد علی مرحوم، مولانا شوکت علی، مولانا ابوالکلام آزاد، حکیم اجمل خاں مرحوم، مولانا عبدالباری فرنگی محلی یہ حضرات ان کی قیادت میں کام کرتے تھے، مولانا عبیداللہ سندھی کو واپس دیوبند بلالیا، مولانا سندھی اپنے استاد کے سیاسی کاموں کے رازدار ٹھہرے، مولانا انور شاہ کاشمیری کو استاذ نے اپنے علمی منصب پر دارالعلوم میں فائز کیا، مولانا شبیر احمد عثمانی حضرت شیخ الہند کی زبان تھے، مولانا حسین احمد مدنی ان کے دست و بازو اور مولانا آزاد کا قلم ان کا قلم تھا۔

مولانا شیخ الہند ہندوستان کی آزادی کی تحریک میں بیرونی ممالک سے امداد کے خواہاں تھے، اس کے لئے انھوں نے زبردست سرگرمیاں کی تھیں اور یہی تحریک ریشمی خطوط کی سازش کے نام سے مشہور رہی ہے، مولانا سندھی کو اسی تحریک کے سلسلہ میں اپنا وطن چھوڑنا پڑا اور ۲۵ سال کامل وہ غیر ملکوں میں ہزاروں تکلیفوں کو جھیلتے اور مصائب کا مقابلہ کرتے پھرتے رہے اسی شوق میں انھوں نے اپنی زندگی گذاردی اور اسی مقصد میں وہ مر مٹے۔

۱۹۳۹ء میں جب مولانا کی واپسی کی تحریک اٹھی تو دیوبند مولانا سے اپنے قدیم تعلقات کی بنا پر خاص طور پر اپنے اس گم شدہ فرزند کی بازیابی کا خواہشمند تھا اور ہم سب کی خواہش تھی کہ جس مرد مجاہد کے عزم و حوصلہ کی بہت سی داستانیں ہم نے اپنے ماحول میں سنی ہیں، اسے اپنی آنکھوں سے بھی دیکھ لیں، آخر ایک دن شام کو معلوم ہوا کہ مولانا دہلی سے بغیر کسی اطلاع کے دیوبند پہنچے اور لوگوں نے انھیں اس حالت میں پایا کہ وہ اسٹیشن سے مدرسہ میں پہنچکر مدرسہ کی مسجد میں شکرانہ کی دو نفلیں پڑھ رہے تھے، دیوبند آنے کی اطلاع آپ نے پہلے سے اس لئے نہیں دی تھی کہ دیوبند ان کا علمی زاد و لوم تھا، یہاں وہ اپنے استقبال اور شان و شوکت کو پسند نہیں فرماتے تھے، دوسرے دن مولانا صبح کے وقت اس راقم الحروف کے گھر پر تشریف لائے، گرمی کا موسم تھا، رات کو دیر تک دوستوں سے گپ شپ رہی اور وقت پر سونے کا موقعہ نہ ملا، اس لئے میں اپنے مردانہ مکان میں صبح ۸ بجے تک پڑا سوتا رہا، میری آنکھ کھلی تو دیکھا کہ ایک بوڑھا انسان سب سے آگے ہے اور اس کے پیچھے پچاس ساٹھ آدمیوں کا ہجوم ہے۔ میں نے مولانا کو اس سے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا اس لئے پہچان نہیں سکا، مولانا نے میری حیرت کو ختم کرنے کے لئے پیش قدمی فرمائی اور ارشاد ہوا کہ "عبید اللہ سندھی"! اور پھر مجھے سینہ سے لگا لیا، پیشانی پر بوسہ دیا، مجھ سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا کہ "یہ میرے رفیق درس اور رفیق فکر مولانا انور شاہ کاشمیری کی نشانی ہے"

میری والدہ محترمہ مولانا سے اس وقت سے نیاز رکھتی تھیں جب مولانا دیوبند تشریف فرما تھے اور میرے والد مرحوم سے ان کے خاص تعلقات تھے اور ان کا ہر وقت کا اٹھنا بیٹھنا تھا، والدہ نے چائے کا انتظام کیا، چائے کے وقت مولانا شبیر احمد عثمانی اور کئی اور بزرگ بھی موجود تھے، مولانا بڑی

بے تکلفی اور سادگی سے چائے پیتے جاتے تھے، اسی مجلس میں انھوں نے بڑی شفقت سے مجھ سے فرمایا کہ " مکہ مکرمہ میں اردو کے ایک رسالہ میں تمہارا مضمون ہم نے پڑھا تم ہمارے ساتھ رہو، ہم تمہیں کام کرنے کا ڈھنگ بتا دیں گے، میں نے برجستہ جواب دیا کہ حضرت یہ جھگڑا میرے بس کا نہیں، آپ خانہ بدوش آدمی ہیں، ۲۵ سال کے بعد اب گھر واپس آئے ہیں، کابل، روس، ترکی اور حجاز کی زمین ناپتے رہے، فقر و فاقہ میں آپ کی بسر ہوتی ہے، اپنا عیش و آرام آپ نے تج دیا ہے، میں غریب ان مصیبتوں کو جھیلنے کے لئے حوصلہ کہاں سے لاؤں گا مولانا اس پر ہنس دیئے۔

وطن کی واپسی کے بعد مولانا چھ سات سال زندہ رہے، دیوبند، دہلی اور لاہور میں بارہا ان سے ملاقات ہوئی مگر سیاسی مباحث پر کبھی میں نے ان سے گفتگو نہیں کی، اس کی پہلی وجہ تو یہ تھی کہ میں خود کوئی عملی سیاسی آدمی نہیں، سیاسیات سے بہت معمولی سا تعلق ہے ....

...اور یہ معمولی سا تعلق لمبی بحث و مناظرہ کی الجھنوں کو گوارہ نہیں کرتا، دویم مولانا اپنی عظیم الشان سیاسی جدوجہد میں ناکام ہو جانے کے باعث بے حد چڑچڑے اور غصہ ور ہو گئے تھے۔ جس ملک اور قوم کے لئے انھوں نے اپنی زندگی تج دی تھی، اپنی زندگی کے ۲۵ سال دیارِ غیر کی ٹھوکریں کھانے اور غربت کی ناقابلِ برداشت تکالیف جھیلنے میں گذار دیئے تھے اور جس کی بہتری اور سودمندی کے خیال نے اس مردِ مجاہد کی جوانی کو بڑھاپے کے ضعف و نقاہت میں بدل دیا تھا، اسے اپنے فرائض سے اتنا غافل اور اپنی ذمہ داریوں سے اتنا بے فکر پا کر انھیں غصہ آجاتا تھا، بگڑ جاتے تھے، ڈانٹ دیتے تھے اور خفا ہو جاتے تھے، میرا مولانا سے بارہا سامنا ہوا مگر محض اس خیال سے کہ کوئی سوال کیا تو خواہ مخواہ بگڑ جائیں گے، کبھی مولانا کی بساطِ علم و فکر کے اطراف و جوانب پر ہاتھ نہیں ڈالا، ان کی مجلس میں حاضر ہوا

ازخود جو کچھ انھوں نے فرمایا سُن لیا، جو کچھ کہا اُسے باور کیا اور اٹھ کر واپس آگیا۔

البتہ لاہور میں ایک دفعہ ایسا اتفاق ہوا کہ میں کشمیر سے واپس آتے ہوئے شیرانوالہ دروازہ میں اپنے بزرگ مولانا احمد علی صاحب کے یہاں ٹھہرا ہوا تھا اور یہی جگہ لاہور میں مولانا کا مسکن اور مستقر تھی، رات کو سوتے وقت وہاں صرف مولانا سندھی اور میں تھے، میری زبان سے اس وقت بے ساختہ نکلا کہ "مولانا آپ اپنے ہی حلقہ میں تشریف رکھتے تو اچھا تھا، وہاں درس وتدریس کا مشغلہ رہتا یا اپنا سیاسی کام کرتے"! میں نے دیکھا کہ میری اتنی ذراسی بات سے مولانا کے تیور بگڑ گئے اور درشت لہجہ میں فرمایا کہ ہمیں اس طرح کے مشوروں کی حقیقت معلوم ہے، ہم جانتے ہیں کہ ہمیں مستقبل میں کیا کرنا ہے۔"

میں نے فوراً بات بدل دی، عرض کیا کہ مولانا لاہور میں بہت گرمی ہے، میں تو کشمیر سے واپس آکر گرمی بہت زیادہ محسوس کرتا ہوں، اور آپ کو تو اسہال کا مرض ہے، اس گرمی میں تو آپ کو بہت تکلیف ہوتی ہوگی، مولانا سمجھ گئے کہ اس نے بات بدل دی ہے، انھوں نے اپنا غصہ تو پی لیا، مگر چارپائی سے اتر گئے اور صحن میں چہل قدمی فرمانے لگے، کچھ ایسے انداز میں رُک رُک کر ٹہل رہے تھے کہ گویا ماضی کی بہت سی داستانیں انھیں یاد آگئی ہیں، بہت ساری تلخیاں اور بہت سے دکھ درد جاگ اٹھے ہوں آسمان پر چاند اپنی پوری تابانی کے ساتھ چمک رہا تھا، عمارت کی چوتھی منزل پر ایک خاموشی چھائی ہوئی تھی، ایک سکوت، ایک سناٹا، ایک افسردگی اور ایک گہری اور طویل خاموشی ۔ مولانا عبید اللہ سر برہنہ تھے، آہستہ آہستہ ٹہل رہے تھے اور میں شرمندگی اور ندامت سے گڑا جاتا تھا کہ میں نے کہاں کی بات کہاں چھیڑ دی، میرے منہ سے کیا نکل گیا اور میں نے مولانا کو

کیوں یہ تکلیف دی ؟

آخری ملاقات مولانا مرحوم سے یہیں دیوبند میں مولانا شبیر احمد عثمانی کے مکان پر ہوئی۔ مولانا عثمانی دارالعلوم سے الگ ہو چکے تھے، سیاسی فکر کے لحاظ سے انھوں نے لیگ کی رہنمائی قبول کر لی تھی مگر اس ساری مجلس میں اس موضوع پر کوئی بات نہیں ہوئی، آخر میں مولانا سندھی نے مولانا عثمانی سے فرمایا کہ "ہم نے جامعہ ملیہ میں بیت الحکمت کے نام سے اپنا ادارہ قائم کر دیا ہے، ہم چاہتے ہیں کہ استاذ مرحوم کی اس یادگار کے سلسلہ میں ان کے اور شاگرد بھی ہمارا ہاتھ بٹائیں اور ہم فخر یہ کہہ سکیں کہ اس کام میں ہمارے قدیم احباب بھی ہمارے معاون ہیں، اس لئے آپ بیت الحکمت کے سلسلہ میں ہمیں چندہ دیں اور ہماری ذاتی فرمائش یہ ہے کہ یہ چندہ ایک روپیہ سے کم نہ ہو۔"

مولانا عثمانی نے فوراً پچاس روپے حاضر کئے اور کہا کہ تیس روپے آپ کے ذاتی مصارف کے لئے ہیں اور بیس بیت الحکمت کے چندہ کے لئے اور ہمیں خوب یاد ہے کہ مولانا نے باہر نکل کر یہ تیس روپے اپنے نواسے عبید اللہ انور کو جو ان دنوں دیوبند میں پڑھتے تھے دے دیئے اور فرمایا کہ دہلی تک کا کرایہ ہمارے پاس ہے یہ روپے تم لو، یہاں یہ بات بتا دینی بھی ضروری ہے کہ اس مرد مجاہد کی زندگی عجیب طرح گذری۔

دہلی میں اوکھلے سے جامع مسجد تک آنے کے لئے ان کے پاس تانگہ یا ٹرام کا کرایہ نہیں ہوتا تھا اور یہ بوڑھا اور ضعیف آدمی میلوں کا یہ چکر پیدل پورا کرتا تھا۔

اخبار میں مولانا سندھی کی وفات کی خبر آئی کہ سندھ کے کسی گاؤں میں اس مردِ مجاہد اور مشرق کے اس مفکر جلیل نے انتقال فرمایا تو کئی دوست جمع تھے، ایک نے کہا کہ علم اور سیاسی فکر کا ایک ستون گر گیا، دوسرے نے کہا

کہ علم اور سیاسی فکر کا ایک ستون گر گیا، دوسرے نے کہا اسلامیات کے ایک زبردست عالم نے وفات پائی، تیسرے نے کہا، ایک سخت جان اور جفاکش لیڈر کی موت، چوتھا بولا کہ ناکام ترین لیڈر! اور مجھے یہ آخری بات پسند آئی، حقیقتاً مولانا ایک ناکام ترین لیڈر تھے، اپنی تحریک کی ناکامی، اپنے دوستوں کی خود غرضیاں، ہندوستانی قوم کی بے شعوری اور ناسمجھی، ۲۵ سال کی طویل جلاوطنی اور اس مدتِ طویل میں ہزاروں میل کا پیدل سفر، کبھی کبھی وقت کا فاقہ اور قسم قسم کی تکلیفیں، پھر وطن واپس آکر یہاں کے فرقہ وارانہ شور اور شر میں اپنے منجھے اور سلجھے ہوئے فکر کی ناقدری، طبقۂ علماء کا جمود و قدامت پسندی اور انگریزی پڑھے لکھے لوگوں کی بے راہ روی، یہ مسلسل مصائب اگر اس شخص کے دماغ پر برا اثر نہ ڈالتے اور اسے بھی کسی صاف اور ہموار میدان میں کام کرنے کا موقعہ ملتا تو یقیناً ہندوستان کی تاریخ آزادی میں عبیداللہ سندھی کا نام گاندھی جی، شری سبھاش چندر بوس، پنڈت جواہرلال، مولانا آزاد سردار پٹیل اور راجندر پرشاد کے ساتھ لکھا جاتا، مگر آج مولانا کو اور ان کے کارناموں کو، ان کی محنتوں اور ان کی مشقتوں کی صحیح تفصیل جاننے والا طبقہ بہت ہی محدود ہے، زیادہ لوگ ایسے ہیں جنھوں نے زندگی میں بھی مولانا کو دیوانہ، ملحد، پاگل کہا اور اب بھی اسی نام سے یاد کرتے ہیں۔

ایک دوست نے بتایا کہ مولانا نے ایک دفعہ فرمایا کہ "مجھے تم پاگل کہو مگر میری بات سن لو، اگر تم نے میری ایک بات بھی مان لی تو میری دیوانگی کی قیمت ادا ہو جائے گی۔

اللہ اللہ عجیب لوگ تھے، جو خود کو مٹا کر قوم کو بنا گئے، جنھوں نے اپنی زندگی برباد کر لی مگر ملک اور قوم کی تباہی ان سے نہ دیکھی گئی، جنھوں نے اپنی ساری زندگی، زندگی کی ساری راحتیں، زندگی کے سارے ولولے زندگی کا سارا عیش اپنے مقصد پر قربان کر دیا، زندگی کے اس خاص موڑ پر

جب ہندوستان میں انسانیت اور انصاف کا لفظ ہی رہ گیا، جب یہاں ایک انسان دوسرے کو کھا جانے پر آمادہ ہے، جب مذہب کے نام پر ہندو مسلمان کا گلا کاٹ رہا ہے اور قرآن کی تعلیمات کی روشنی میں مسلمان ہندو پر غضبناک ہے، اس ایثار، بے نفسی، خلوص اور عام انسانیت و محبت کا کیا تصور ہو سکتا ہے؟ یہ تصور شاید تاریخ کی کوئی بھولی بسری کہانی ہو، زمانۂ قدیم کا کوئی گیا گذرا ہوا قصہ اور پچھلے زمانہ جاہلیت کا کوئی غیر دانشمندانہ تخیل، مولانا عبیداللہ سندھی اس شریف اور انصاف پسند دور کی ایک یادگار تھے، جب ہندو مسلمانوں میں سیاسی طور پر کوئی امتیاز نہیں تھا، کہتے ہیں کہ مولانا جب کلکتہ گئے تو سبھاش چندر بوس نے جو ان دنوں اپنی آزاد ہند فوج کا خیال لے کر خفیہ طور سے ہندوستان سے بھاگ جانے کا ارادہ کر رہے تھے، ایک رازدارانہ مجلس میں کئی گھنٹے مولانا سے بات چیت کی اور شری سبھاش احتراماً مولانا کے سامنے بچھے جاتے تھے، چھوٹوں کی طرح ان کی خدمت کرتے تھے اور پروانہ واران پر فدا تھے، مگر میں کہتا ہوں کہ اچھا ہوا مولانا اس وقت سے پہلے مر گئے، وہ آج ہوتے تو مسلمان انھیں ہندوؤں کا غلام کہتے اور ہندو انھیں پاکستان کا ففتھ کالم قرار دیتے، شاعر نے خوب کہا ہے کہ ؎

تھے بہت طعنے ہوس کے اہل دل کی زیست پر
اے تری قدرت! کہ مرگِ عاشقی اچھی رہی

مولانا مناظر احسن گیلانی

دیوبند نے اپنی زندگی کے گذشتہ نوّے ۹۰ سال میں علماء و صلحاء اور فضلا کی جو ایک کثیر جماعت پیدا کی اور جو اپنے علمی فضائل، بہترین خصائل، اچھے کردار، پختہ سیرت اور علمی و عملی صلاحیتوں کی بنا پر ماضی میں مسلمانوں کی مذہبی اور قومی زندگی کی ایک زبردست خدمت گذار ثابت ہو چکی ہے اور مستقبل میں جس کا وجود آب و ہوا کی ناموافقت اور موسم کی قدرتی ناسازگاریوں کی گھپ گھپاؤں میں ایک روشن چراغ کی حیثیت رکھتا ہے ہمارے مخدوم و محترم صاحب العالی والمناقب حضرت مولانا سید مناظر احسن گیلانی دام ظلہ اس جماعت کے ایک ممتاز فرزند ہیں۔ حضرت مولانا اپنی قیمتی تصانیف، بے شمار علمی خدمات، تدریسی خصوصیات، اعتدالِ فکر، پاکیزگی مذاق اور علوم حدیث و قرآن اور ان سے متعلقہ مضامین کے علاوہ عصری معلومات اور دورِ حاضر کی علمی تحقیقات کے ایک نامور سرمایہ دار اور مسلّم الثبوت استاد ہونے کی حیثیت سے کسی تعارف کے محتاج نہیں جس طرح چاند اور سورج کی روشنی چاند اور سورج کی سب سے بڑی تعریف اور سب سے بڑا تعارف ہے اور اس روشنی کی موجودگی میں دونوں خارجی تعارف کے محتاج نہیں، اسی طرح مولانا مناظر احسن گیلانی کے علوم و افکار ان کے تعارف کا سب سے بڑا ذریعہ ہیں اور اہل نظر و بصر کے لئے ان کا یہی سرمایۂ علم و فن ایک کارآمد ذریعہ تعارف کی حیثیت رکھتا ہے۔

حضرت مولانا صوبہ بہار کی مردم خیز زمین کے ایک درِ شاہوار ہیں، ضلع مونگیر کا خوش نصیب قریہ "گیلانی" ان کا وطن مالوف ہے، آپ ۹ ربیع الاول سنہ ۱۳۱۰ھ کو اپنے مادری وطن موضع استھانواں میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی مکتبی تعلیم موضع گیلان میں اپنے چچا مولانا حکیم حافظ حاجی سعید ابو النصر گیلانیؒ سے حاصل کی۔ سنہ ۱۳۲۴ھ میں مولانا برکات احمد صاحب کی خدمت میں ٹونک تشریف لائے اور وہاں درسِ نظامی کی ابتدائی کتابیں پڑھیں۔ سنہ ۱۳۳۰ھ میں دار العلوم دیوبند پہنچے شیخ الہند حضرت مولانا محمود الحسن صاحب دیوبندیؒ سے بخاری اور ترمذی پڑھی اور صحیح مسلم سیدنا الامام حضرت مولانا الشاہ محمد انور شاہ صاحب کشمیری رحمہ اللہ سے پڑھی اور ابوداؤد حضرت مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی رحمہ مولانا سید اصغر حسین صاحبؒ سے پڑھی۔ حضرت مولانا سید حسین صاحب مدنی رحمہ اللہ سے نسائی اور دیگر اساتذہ سے دورۂ حدیث کی باقی کتب پڑھیں۔

فراغت کے بعد سال ڈیڑھ سال رسالہ جات "القاسم" و "الرشید" دیوبند کی ادارت کا کام انجام دیتے رہے۔ آخر میں جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن میں شعبۂ تعلیمات سے تعلق قائم ہوا، اور اب وظیفہ یاب ہو کر اپنے وطن گیلان میں خانہ نشین ہیں۔ سنہ ۱۳۳۲ھ میں دورۂ حدیث کا امتیازی نمبروں میں امتحان پاس کیا تھا۔

دیوبند کے دورانِ قیام میں آپ کو وقت کے جیّد علما و محققین سے علمی فوائد حاصل کرنے کا بہترین موقعہ ملا، ایک طرف یہ نامی گرامی اساتذہ تھے جن کی بارگاہ سے ہر وقت علم و فضل کے نادر ذخیرے اور بہترین سرمایے مستحق اصحاب کو بڑی سخاوت و سیر چشمی کے ساتھ تقسیم ہوتے رہتے تھے اور دوسری طرف مولانا مناظر احسن گیلانی سا شاگرد جن پر حق تعالیٰ شانہٗ کی

رحمتِ ربانیہ نے علم کے دروازے کھول دیئے تھے، کیمیا کا اگر دنیا میں کوئی وجود ہے تو وہ وجود چند ضروری اجزار کو باہم ملانے اور انھیں مقررہ طریقہ پر آنچ پہونچانے اور پھونکنے سے پہلے وجودی شکل اختیار نہیں کر سکتا یہ اجزار ہاتھ لگ جائیں اور کیمیا ساز کو انھیں آنچ پہنچانے کا سلیقہ بھی آتا ہو تو پھر سونے کے توڑے اور روپوں اشرفیوں کا ڈھیر کیمیا گر کی اپنی قسمت کا حصہ بن سکتے ہیں۔

دارالعلوم کے ان سرآمدِ روزگار اکابر اور مولانا مناظر احسن گیلانی کا باہم اجتماع کیمیائے علم وفن کا ایک مجرب اور بار بار آزمودہ نسخہ تھا، نسخے کے سارے اجزار مہیا ہو گئے اور انھیں صحیح طریقہ پر ترکیب دی گئی تو اس کے نتیجے میں مولانا مناظر احسن گیلانی، ان کے علوم و نظریات، ان کی قوت تحریر و تقریر ان کی وسیع علمی معلومات اور علوم قرآن وحدیث میں ان کا نچا تُلا فکر، یہ اپنے ایک وجود میں بہت سے فائدے دینے والی کیمیا اور اپنی قدر و قیمت میں سونے چاندی اور لعل و جواہر سے بھی بدرجہا بہتر اور لازوال دولت پیدا ہوئی۔

مولانا مناظر احسن گیلانی کو اپنے ان تمام اساتذۂ دیوبند کے علمی احسانات کا اعتراف ہے، خصوصاً حضرت علامۃ العصر مولانا السید محمد انور شاہ کاشمیری رحمۃ اللہ علیہ کے فیضانِ علمی کے جذبۂ ممنونیت سے ان کا قلب لبریز ہے، مجھے اپنے ایک گرامی نامہ میں حضرت مولانا نے حیدرآباد سے لکھا تھا کہ:۔

میں کیا عرض کروں

گر خار گر گل ست   من ہمہ آوردۂ تست

زندگی میں وہی چند لمحاتِ حیات تھے جو حضرت شاہ صاحب قدس اللہ سرہٗ العزیز کے صحبت طیبہ میں گذرے

یوں تو فقیر نے بہتوں سے پڑھا اور استفادہ کا شرف حاصل کیا ہے لیکن اپنی پڑھی ہوئی چیزوں سے کام لینے کا ڈھنگ آستانۂ انوریہ سے آیا، جن دنوں القاسم والرشید میں ابتدائی مشق مضمون نگاری کی کر رہا تھا تو ایک نہیں متعدد مضامین حضرت شاہ صاحب کو سنانے اور اصلاح لینے کے بعد پریس میں دیتا تھا، وہ اصلاحیں کیا ہوتی تھیں زمین آسمان بنتی تھی اور آسمان عرش کا پایہ حاصل کرتا تھا۔"

مکتوب مولانا گیلانی از حیدر آباد، مورخہ ۹ر اگست ۱۹۴۷ء

دیوبند میں درس نظامی کی تکمیل کے بعد فوراً ہی حضرت المخدوم مولانا حبیب الرحمٰن العثمانی سابق صدر مہتمم دار العلوم کی جوہر شناسی اور قدر دانی نے انھیں دار العلوم کے دو علمی پرچوں القاسم اور الرشید کی ترتیب و تحریر پر مامور کر دیا۔ یہ دونوں پرچے اپنے اپنے وقت میں ملک کے ممتاز علمی رسالوں میں شمار کئے جاتے تھے اور دیوبندی جماعت کے تمام فضلاء و محققین اپنی تازہ بتازہ علمی تحقیقات انہی رسائل کے صفحات پر پیش کرتے تھے۔ الرشید والقاسم کے مضمون نگاروں میں حکیم الامت حضرت مولانا تھانوی، حضرت مولانا حبیب الرحمٰن عثمانی، حضرت مولانا سید محمد انور شاہ کاشمیری، مولانا شبیر احمد عثمانی، مولانا مفتی عزیز الرحمٰن عثمانی، مولانا سراج احمد صاحب رشیدی، مولانا اصغر حسین صاحب دیوبندی، مولانا عبید اللہ سندھی، مولانا عبد السمیع صاحب انصاری، مولانا محمد اعزاز علی صاحب مولانا محمد میاں (منصور الانصاری) مولانا عاشق الٰہی صاحب میرٹھی، مولانا حکیم جمیل الدین صاحب نگینوی، مولانا عبد الرحمٰن صاحب خورجوی وغیرہم قابل ذکر ہیں، اور مولانا محمد طیب صاحب، مولانا مفتی محمد شفیع صاحب، مولانا میرک شاہ صاحب کاشمیری، مولانا احسان اللہ خاں

تاجور نجیب آبادی، مولانا شائق احمد عثمانی بھاگلپوری، مولانا محمد طاہر صاحب قاسمی جماعت دیوبند کے ان نوخیز فضلاء کے ابتدائی مضامین بھی انہیں رسائل میں شائع ہوتے رہے ہیں۔ اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ ان دونوں پرچوں کا معیار علمی کیا تھا اور ان کی ترتیب و تحریر کی ذمہ داریاں کیا اہمیت رکھتی تھیں۔

مولانا مناظر احسن گیلانی نے القاسم والرشید کی ادارت کے مختصر دور ہی میں اپنے تحقیقی اور علمی مضامین، ندرت بیان اور والہانہ اسلوب نگارش سے یہ ثابت کر دیا کہ علم و فضل کے نیلگوں آسمان پر ایک نئے ستارے کی ضیاء باری اور ضوفشانی کا اہتمام ہے۔ بزم مہ و انجم آج ایک نئی شان سے دوبالا ہے اور ستاروں کی ساری دنیا اپنے ایک نئے ساتھی کی آمد کا انتظار کر رہی ہے اور دارالعلوم دیوبند کے کسی چھوٹے موٹے سے کمرہ میں ایک ایسی شخصیت زیر تربیت ہے جو اپنے علم و فضل کے زمانۂ شباب میں حافظ ابن تیمیہ، حافظ ابن قیم، امام رازی و فارابی، ابن جوزی، ابن خلدون و شاہ ولی اللہؒ کی وسعت معلومات اور تبحر علمی کی یاد تازہ کر دے گی۔

اس دور میں بہت سے مضامین و مقالات کے علاوہ "کائنات روحانی" اور "سیرت ابوذر غفاری" کے نام سے دو کتابیں بھی حضرت مولانا کی دیوبند سے شائع ہو کر مقبول عوام و خواص بنیں، پھر حضرت مولانا عثمانیہ یونیورسٹی کے تعلق ملازمت کے سلسلہ میں حیدرآباد تشریف لے گئے، حیدرآباد میں کم و بیش پچیس سال حضرت مولانا کا قیام رہا، جہاں عثمانیہ یونیورسٹی میں آپ کی تدریسی خدمات اپنا ایک خاص معیار رکھتی تھیں، آپ کے حلقۂ درس سے بہترین علماء اور اہل قلم حضرات نے تربیت پائی اور وہ اپنے ذوق اور حضرت مولانا کی بزرگانہ توجہات سے بڑے سے بڑے

علمی منصب کی ذمہ داریوں کو پورا کر دینے کے قابل بن گئے، حیدر آباد میں حضرت مولانا مناظر احسن کی درسی خدمات گذشتہ حیدر آباد کی علمی زندگی کی ایک شاندار علامت تھی، جس طرح بغداد و غرناطہ اور قرطبہ و قاہرہ میں اسلامی خلافتوں اور حکومتوں کے زریں عہد میں دنیا کے بڑے بڑے علماء دین کھنچ کھنچ کر وہاں پہنچ گئے تھے اور ان کی درسگاہوں سے علم و فن کے چشمے ابل رہے تھے، اسی طرح حیدر آباد کو اپنے وقت کا بغداد سمجھئے اور مولانا مناظر احسن کو اس گہوارۂ علمی کا امام الحرمین یا امام غزالی ؒ۔

مولانا کی تصنیفی زندگی تو دیوبند ہی سے شروع ہو گئی تھی، لیکن اس زندگی پر جوانی کی پھبن حیدر آباد ہی میں آئی، صدق، معارف، برہان، الفرقان، ترجمان القرآن، دار العلوم اور ملک کے دوسرے علمی رسائل کے صفحات گواہ ہیں کہ سیکڑوں مقالات مولانا کے قلم سے نکلے اور ان رسائل میں شائع ہو کر علم و ادب میں ایک بیش بہا اضافہ کی حیثیت اختیار کر گئے۔

آپ کی مقبول ترین تصانیف، نظام تعلیم و تربیت، الدین القیم النبی الخاتم، تدوین حدیث، مسئلہ سود وغیرہ حیدر آباد ہی کی یادگار ہیں اور ان مطبوعہ تصانیف کے علاوہ بہت سے مسودات ابھی حضرت مولانا کے پاس محفوظ ہیں جن کی طباعت و اشاعت امت کی موجودہ نسل کے اہل علم و اہل مذاق افراد کے احساس فرض سے بطور خاص مطالبۂ عمل کرتی ہے۔

یقین رکھیے کہ حضرت مولانا کا جو سرمایۂ علم و فضل کتابوں اور رسالوں میں چھپ کر باہر آچکا ہے مقدار میں اس سے بہت زائد اور معیار میں اس سے بلند تر ذخیرہ ابھی مسودات ہی کی شکل میں محفوظ ہے۔

پہلے دور میں جو شراب پی اور پلائی گئی تھی وہ بھرے ہوئے جام وسبو کے اوپر اوپر سے لنڈھا دی گئی تھی وہ چیز جسے شاعرانہ زبان میں دردِ تہ جام کہئے یا بادہ گسارانِ بدمست کے الفاظ میں تلچھٹ ہی تلچھٹ کہکر پکاریئے وہ ساری کی ساری پیرِ مغاں کے پاس سربمہر محفوظ ہے۔

گماں مبر کہ بپایاں رسید کارِ مغاں
ہزار بادۂ ناخوردہ در رگِ تاکست

پھر حضرت مولانا ان علمی، درسی اور تحقیقی کمالات کے علاوہ تقریر و خطابت کا ایک خاص انداز بھی رکھتے ہیں اور یہ سچ ہے کہ نہ صرف ان کی تقریروں میں زبان و بیان کی لطافتیں اور استدلال و انضباط کی حدتیں تو عروسِ بہار کے قدرتی حسن کی طرح یوں پھٹی پڑتی ہیں کہ ان پر تصنع و تکلف کا کوئی شبہ نہیں ہوتا، جس طرح بہار، موسم کی خوشگواری، شجر و ثمر کی ایک نئی زندگی، بادِ شمال کی مستانہ روی اور غنچہ و گل، لالہ و نرگس اور نسرین و نسترن کے فلک شگاف قہقہوں کا ایک دوسرا نام ہے، اسی طرح مولانا مناظر احسن کی تقریر، لب و لہجہ کی مٹھاس، الفاظ کی صحیح نشست و برخاست مضامین کی آمد، معلومات کی وسعت اور اسلوب و انداز کی جدت و ندرت کی جامع ہے۔ جناب ماہر القادری مدیر فاران نے کہا تھا کہ نواب بہادر یار جنگ نے جن کی سیف زبانی اور شعلہ بیانی سے اب تک سینۂ باطل میں ایک تلاطم کی سی کیفیت طاری ہے کہا تھا کہ "میں نے تقریر مولانا مناظر احسن گیلانی سے سیکھی ہے۔ میلاد النبی صلی اللہ علیہ وسلم کے جلسوں میں جب مولانا حیدر آباد میں تقریریں فرماتے تھے تو موڑھا لئے ان کے پیچھے دوڑتا رہتا تھا" اور نواب بہادر یار جنگ کے یہ الفاظ مولانا کی تقریر کے حق میں "تحسین سخن شناس" کی حیثیت رکھتے ہیں جس کے بعد مولانا کی تقریر کسی اور تبصرہ کی محتاج نہیں رہتی۔

مولانا ممدوح اب عثمانیہ یونیورسٹی کی خدمات سے سبکدوش ہو کر اپنے وطن میں قیام پذیر ہیں اور اس وقت فکر و مطالعہ کے مستقل مشاغل کے ساتھ بڑا کام، مولانا محمد قاسم نانوتوی قدس سرہٗ کی تاریخ حیات کی تالیف و تحریر ہے، حضرت مولانا سوانح قاسمی کو اپنی تصنیفی زندگی کا ایک خاص فریضہ سمجھ کر لکھ رہے ہیں اور جاننے والے جان سکتے ہیں جس تصنیف پر مولانا مناظر احسن سا نامور مصنف اپنی دماغی پرواز کا سارا سرمایہ صرف کر دینے کا تہیہ کر چکا ہو وہ ضبط تحریر میں آجانے کے بعد اپنے حسن کی رعنائی نقش و نگار کے بانکپن، چشم و ابرو کی خوبصورتی اور آتش رخسار سرخ کی تمازت سے کیا کچھ نہ کر دیگی۔؟

آنچہ من در بزم شوق آوردہ ام دانی کہ چیست
یک چمن گل، یک نیستان نالہ یک خم خانہ مے

میں یہاں اس اظہار واقعہ پر اپنے لئے فخر محسوس کرتا ہوں کہ مولانا گیلانی سے مولانا محمد طیب صاحب مہتمم دارالعلوم دیوبند نے سوانح قاسمی کے جمع و ترتیب کی فرمائش کی اور مہتمم صاحب کو اس ضروری خدمت کی طرف اس عاجز و ناکارہ نے توجہ دلائی۔

کم و بیش ایک صدی کے ماہ و سال کے الٹ پھیر کے باوجود مولانا نانوتوی کے حالات زندگی اور افکار ذہنی کی اشاعت سے تساہل دیوبند کی علمی زندگی کا ایک دردناک سانحہ تھا اور مجھے جب کبھی اس کمی کا خیال آتا تو یقین رکھئے کہ میں اپنے ضمیر کو اپنی جگہ شرمندہ پاتا تھا، لیکن، "دیر آید درست آید" والے مقولہ کے صحیح معنی اس وقت معلوم ہوئے جب مولانا گیلانی نے اس ضروری خدمت کے لئے بطوع و رغبت اپنی آمادگی ظاہر فرمائی، مولانا نانوتوی کے تجدیدی کارناموں اور فلسفیانہ و حکیمانہ افکار کی تشریح و تذکیر کا حق بلاشبہ مولانا گیلانی کو پہنچتا تھا، اور

یہ کیسے ہو سکتا تھا قدرت نے جس کام کے لئے مولانا گیلانی کا انتخاب فرمایا تھا وہ کام ایک واہمہ کی حیثیت سے بھی کسی اور کے دماغ میں پیدا ہو سکتا؟ حق تعالیٰ حضرت مولانا کو اس علمی خدمت کی تکمیل کا موقعہ اور امت کو اس عظیم الشان کارنامہ کی قدر کی توفیق دے۔

میں نے اس تحریر کے شروع میں کہا تھا کہ مولانا مناظر احسن گیلانی جماعت دیوبند کے ایک ممتاز فرزند ہیں اور دیوبندی علوم و نظریات نے جن صاف دماغوں کو اپنا آشیانہ بنا لینے کے قابل سمجھا ہے مولانا گیلانی انہی گراں منزلت اور عالی مرتبت حضرات میں سے ہیں اور اب اخیر میں مجھے یہ عرض کر دینے میں صاف گوئی سے کام لینا چاہئے کہ مولانا گیلانی علماءِ دیوبند کی جامعیت علوم، پختگیٔ فکر، معارف رسی، حقائق شناسی، اور سادہ و پُر خلوص زندگی کے ایک آخری یادگار ہیں۔ مرزا صاحب علیہ الرحمۃ کی روح مجھے اشارہ کرتی ہے کہ سوءِ ادب کا خیال نہ کر اور یہاں بے تکلف میرا یہ شعر پڑھ دے ؎

خدا کے واسطے اس کو نہ ٹوکو
یہی اس شہر میں قاتل رہا ہے!

مولانا حفظ الرحمٰن

دل شعلہ لب ساز اب بھی جاں زہرہ گداز اب بھی
یہ ان کا مجاز اب بھی لاکھوں میں اک انساں ہے

وہ ایک روح دلنواز، ایک پیکر حسن و محبوبی، ستاروں کی تنک تابی اور شب ماہ کا ایک کیف جاوداں، ایک موجۂ نسیم و صبا، ایک نکہت گل، ایک صبح بہاراں، ایک گل لالہ، ایک شعلہ خرمن سوز، ایک شرارہ آتش افروز، رونق چمن، چراغ انجمن، یثرب و بطحا کی ایک مقدس آواز، وادی عرفات اور جبل احد کا ایک نعرہ فلک پیما، گنگا کی عظمت اور دریائے جمن کا بانکپن قرآن کا اعلان حق اور وطنی وفاداری کا ایک نشان راہ، وہ وضعداری شرافت اور مروت کا ایک دریا، جرأت اور جذبۂ حق گوئی کا ایک پہاڑ، تہذیب و انسانیت کی ایک دیوار چین اور زندگی کی بنیادی سچائیوں کا ایک تاج محل، علوم شریعت کا ایک خزانہ اور عصری سیاست کا ایک ہما جس نے سالہا سال مُردوں میں کھڑے ہو کر اذان دی، جس نے لاکھوں اجل نصیب مسلمانوں کے لاشوں، ان کی لٹی ہوئی عزتوں اور مٹتی ہوئی عظمتوں کی حفاظت کی! جس کی زندگی کے پندرہ برس مظلوموں کی

آہوں اور سسکیوں کے درمیان گزرے، جس نے سر برہنہ تلواروں اور انتقام ومخالفت کی بھڑکتی ہوئی آگ کا جی جان سے مقابلہ کیا، جہاں کسی مسلمان کے رونے کی آواز کان میں آئی وہیں وہ اپنے جسم وجان کی پرواہ کئے بغیر آگے بڑھ گیا، جس نے چٹائی پر بیٹھ کر مخلوق خدا کی خدمت کی اور اس بے غرضانہ خدمت کی بدولت اُن کے دلوں پر حکومت کی، جس کی شعلہ بیانی شعلہ نفسی اور شعلہ نوائی سے حضرت عمر فاروق رضؓ کے جلالِ ایمانی کا چراغ روشن اور جس کی فصاحت وبلاغت حضرت علی کی سحر بیانی کے مشابہ جس نے اپنے علم وتحقیق سے اپنے استاذ علامہ انور شاہ کشمیری کے وہبی علوم کی یاد تازہ کی اور جس نے اپنے جوش مجاہدانہ اور جذبۂ فداکارانہ سے اپنے استاذ الاساتذہ مولانا محمود الحسنؒ کی روح ایمانی کو زندہ کیا ساری دنیا انھیں مولانا حفظ الرحمٰن کہتی ہے۔

مگر میرے نزدیک وہ مولانا کی قسم سے بہت آگے کی چیز ہیں۔ زندگی کے تیس سال کا ساتھ کوئی معمولی ساتھ نہیں، اس لمبے عرصہ میں ان کی زندگی کے سبھی پہلو میں نے دیکھے، ہر معیار پر میں نے انھیں جانچا اور ہر کسوٹی پر انھیں پرکھا، مگر وہ ہمیشہ کندن سونا ہی نکلے، ہمیشہ ایک لعل شب تاب ہی دکھائی دیئے، یہ مردِ درویش ظاہری شان وشوکت سے مستغنی، فوج وفرا اور پیل وپیادہ سے بے نیاز ہے، اس کی زندگی کا حسنِ خارجی کسی زیبائش وآرائش کا محتاج نہیں، یہ اپنی اسی سادگی اور بے نیازی میں دور دور تک مؤثر، اسی بے سروسامانی میں از کراں تا بکراں رواں دواں ہے، ایک روشنی ہے جو برابر آگے بڑھتی اور پھیلتی رہی ہے، ایک سچائی ہے جس نے دشمنوں سے بھی خراجِ تحسین وصول کیا ہے، ایک صداقت ہے جس کا اعتراف کئے بغیر چارہ نہیں —

شعلہ نفس اور گرم رو حفظ الرحمٰن بگڑنے پر آ گئے تو اسے سنبھالنا مشکل ہو

اور اس کا بگڑنا، خفا ہونا اور شیر کی طرح گرجنا بھی ایسا کہ ہزاروں حلم، بردباری اور نرمی و مسکنت اس پر قربان، اور مزاج پہ قدرت کا یہ عالم کہ اسی بگاڑ ہی میں وہ بناؤ کے راستے ڈھونڈ لیتے ہیں۔ بگڑتے بگڑتے وہ آپ کے بن جاتے ہیں، روٹھتے روٹھتے من جاتے ہیں، بچوں کی طرح معصوم، غصہ اور سادہ دل لوگوں کی طرح نہ ٹھیرنے والی ناراضگی۔

حفظ الرحمٰن ایک شخص نہیں ہے ایک تاریخ ہے، ایثار و استقلال کا ایک افسانہ ہے، جرأت و شجاعت کا ایک دور ہے اور حرکت و عمل کا ایک نمونہ ہے۔

جامعہ ڈابھیل کے کسی اجتماع میں مشہور شعلہ مقال خطیب امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ نے استاذ الاساتذہ علامہ سید انور شاہ کشمیری کے متعلق کہا تھا کہ میں ان کے لئے اس سے زیادہ کیا کہوں کہ وہ صحابہ کے قافلہ کے ایک آدمی تھے جو بچھڑ کر اس دور میں آ گئے تھے۔"

یہ بخاری صاحب کے اس جملہ کی نقل نہیں بلکہ اپنی جگہ ایک صداقت ہے کہ مولانا حفظ الرحمٰن اس نسل کے ایک فرد ہیں جس نے جزیرہ نمائے عرب سے نکل کر اپنے گھوڑوں کی ٹاپوں سے درہ خیبر اور درہ کوہاٹ کی پہاڑیوں، سندھ اور راجپوتانہ کے بے آب و گیاہ صحراؤں، بحر عرب کے ساحلوں، ترکستان و خوارزم کی وادیوں، ختطا و ختن کے میدانوں، کشمیر و ایران کے خیابانوں اور ممالک مغرب کے قلب و جگر کو روند ڈالا تھا۔

اٹھو اور ایک دفعہ حفظ الرحمٰن کی صورت دیکھ لو، تم نہیں تمہاری آنے والی نسلیں تک اس پر فخر کریں گی کہ ہمارے بڑوں نے اسی مردِ صف شکن و صف آرا کو دیکھا تھا جس کے ہاتھ میں تلوار نہیں تھی مگر

اس نے تیغ رانی کے جوہر دکھائے، جس کے پاس کچھ نہیں تھا مگر اس نے سب کچھ رکھنے والوں کا مقابلہ کچھ اس شان سے کیا کہ طاقت زچ ہو کر تھک گرا اور بے جان ہو کر پیچھے کو گر پڑی۔

آج!

مولانا حفظ الرحمٰن بیمار نہیں بلکہ چار کروڑ ہندوستانی مسلمانوں کا دل مضطرب ہے۔

کریما! گنبدِ خضرا میں آرام فرمانے والے سید الرسل کا صدقہ مسلمانوں کے چمنستانِ حیات کی یہ بہار قائم رہے، مسلمانوں کی یہ زبان بولتی رہے یہ دل دھڑکتا رہے اور یہ چراغ روشن رہے۔

دارالعلوم کا ایک فرزند

مولانا سید مناظر احسن گیلانی

(۲)

راقم الحروف نے ایک ضرورت سے حضرت مولانا سید مناظر احسن صاحب گیلانی کے متعلق ایک مضمون لکھنا شروع کیا تھا لیکن پھر ایک خاص وجہ سے اس مضمون کو چھوڑ کر اسی موضوع پر دوسرا مضمون لکھنے کا ارادہ کیا، یہ پہلا مضمون اگرچہ ناتمام رہا اور جو چیزیں اصل مضمون کی حیثیت سے لکھنی تھیں وہ اس میں نہ آ سکیں لیکن یہ ناتمام مضمون بھی حضرت مولانا مناظر احسن صاحب کی شخصیت اور علم و فکر کے اس منظر کو واضح کرتا ہے، قارئین اجتماع کے مطالعہ کیلئے یہ تحریر حاضر خدمت ہے۔ شاید آئندہ کسی موقعہ پر یہ ادھوری تحریر مکمل ہو سکے ؎ بادہ گر خام بود پختہ کند شیشۂ ما

ہندوستان کی طویل سیاسی تاریخ کے جو حقائق اپنی اہمیت کے لحاظ سے کسی تعارف و تشریح کے محتاج نہیں، انہی حقیقتوں میں سے یہ ایک حقیقت ہے کہ انگریزی حکومت کے تسلط کامل کے بعد ہندوستان میں دینی برکات، اسلامی علوم و معارف اور مذہبی زندگی کے لئے دیوبند کی جماعت علماء مدارِ کل کی حیثیت رکھتی ہے، تقریباً ایک صدی تک

اس جماعت نے اپنی عملی جدوجہد، علمی کاوشوں، تصنیفی خدمات، تبلیغی مہمات اپنی اخلاقی طاقت اور روحانی برکت سے انگریز کے زمانۂ اقتدار میں اس کے اقتدارِ اعلیٰ کے ہر وقت کی مخالفت کے باوجود اس سرزمین پر دین کو دنیا کی ایک زندہ و فعال طاقت کی حیثیت سے زندہ رکھا، موانع و مشکلات کے وہ خوفناک سیلاب جو اس جماعت کے راستوں کو بار بار روکتے رہے آج بھی تصور و تخیل پر گراں ہو کر گذرتے ہیں مگر یہ مشکلات و موانع اگر شکست کھاتے ہیں تو اہل کار کے ایثار و توکل اور خلوص و بے غرضی کی اونچی اونچی چٹانوں اور عزیمت و فداکاری کے بڑے بڑے پہاڑوں سے۔

یہ قدرت کا ایک کرشمہ تھا کہ دیوبند میں دارالعلوم کے نام سے جو مدرسہ قائم کیا گیا اس کی بنیادیں نام و نمود، شہرت اور ذاتی اقتدار کا سمینٹ نہیں بھرا گیا تھا بلکہ ایسی خلوص و دیانت، حق تعالیٰ کی رضا جوئی اور شریعت مطہرہ کی سربلندی کی نیک خواہشات کی اینٹیں تھیں جو اس وقت کام میں لائی گئیں، دارالعلوم آج اپنی زندگی کا ایک دور پورا کر کے ایک نئی منزل میں قدم رکھ رہا ہے اور وقت کا طبیب جانتا ہے کہ اس کی نبض بدستور متحرک، اس کا قلب اسی طرح سرگرم عمل اور اس کے اعضاء و جوارح اسی شان سے مضبوط و تندرست ہیں، جماعتِ دیوبند کے مورثِ اعلیٰ، امام ہمام، استاذ الکل حضرت شاہ ولی اللہ الدہلوی قدس سرہٗ ہیں، اور اس کی زندگی کا سرچشمہ شیخ وقت جامع الظاہر و الباطن حضرت حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکی کی روحانی زندگی ہے، جامع الفضائل شیخ الاسلام مولانا نانوتوی، فقیہ دوراں امام زماں حضرت مولانا گنگوہی (رحمہم اللہ) حضرت حاجی صاحب کے مخصوص مستفدین میں سے تھے۔

حضرت حاجی صاحب نے شاملی کے محاذ پر انگریز سے شکست کھائی یہ ان کی فوجی طاقت، حربی ساز و سامان اور عسکری تنظیم کی شکست تھی لیکن

ان کی روحانی طاقت، بلند ارادے، دور رس نظر اور محبتِ دین کے جذبات نے کسی قیمت پر شکست تسلیم نہیں کی، ظاہر کی اس شکست کے بعد ان کا باطن عمل کی دوسری راہوں پر جادہ پیما ہوگیا، پہلے وہ سیاسی طاقتوں پر غلبہ پاکر دین قیم کی حیاتِ جدید کی راہیں کھولنے کی فکر فرماتے تھے، تقدیر کی ناموافقت سے یہ تمنا بارآور نہ ہوئی تو ان کے دماغ نے تعلیم و تدریس کے ذرائع سے اسلامی عقائد و اعمال کی حفاظت کا ایک اور نقشہ تیار کرلیا، حضرت حاجی صاحب سے یہ نقشہ ان کی خانقاہ کے دو درویشوں تک پہنچا اور ان دو درویشوں نے اتحادِ مذاق اور موافقتِ خیال کی بنا پر دو سے ایک بن کر اس نقشہ کو ایک عمارت کی شکل دی، ایک حسین خواب کو واقعہ بنا دیا، اس تمنا کو صورت تکمیل دی انھوں نے ایک ایک اینٹ جمع کی اور دار العلوم بنایا، ایک ایک پیسہ مانگا اور دار العلوم کی داغ بیل ڈالی، ایک ایک مسلمان کے دل کے دروازے پر دستک دی اور اسے بیدار کیا، ایک ایک شخص کے برف آلود دماغ پر محبتِ دینی کی آگ سلگا دی، واللہ الموفق وبیدہ الخیر۔

ان دونوں بزرگوں کے بعد پھر سیدنا حضرت شیخ الہند، حضرت مولانا حافظ محمد احمد صاحب، حضرت مولانا حبیب الرحمٰن العثمانی، حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی، حضرت مولانا سید محمد انور شاہ صاحب کاشمیری، حضرت مولانا عبید اللہ سندھی، حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمٰن عثمانی، حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی، حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی، یہ وہ بزرگ ہیں جو اپنے اپنے وقت میں اس دینی درس گاہ، اور روحانی دار التربیت کے نگران و نگہبان رہے ہیں۔

دیوبند نے اپنی ۸۰ سال کی زندگی میں علماء، فضلاء، صلحاء اور ابرار کی جو جماعت کثیر پیدا کی اور جس جماعت نے اطراف و اکناف عالم میں علوم دینی، اخلاق محمدی اور برکات اسلامی کی نعمتیں عام کر دیں، ہمارے بزرگ

صاحب المعالی والمناقب، ذی المکارم والمواہب، فاضل جلیل، رئیس التحریر حضرت مولانا سید مناظر احسن گیلانی (مدا اللہ فیوضہ علی اجساد الشربانی) اسی جماعت کے ایک ممتاز فرزند ہیں۔ حضرت مولانا موصوف بہار کی مردم خیز سرزمین کے ایک درشاہ وار ہیں اور ان کی ابتدائی تعلیم دوسرے مدارس کی ممنون منت ہے، لیکن مولانا موصوف جب بسلسلہ تعلیم دیوبند تشریف لائے تو انھوں نے دیوبند کے فکر، دیوبند کے طرز تعلیم، دیوبند کے علمی مسلک، دیوبند کے علمی ماحول اور بزرگانِ دیوبند کی علمی صحبتوں میں اپنے دل وضمیر کی سیرابی کا سامان موجود پایا، چنانچہ دارالعلوم کی تعلیم و تربیت نے حضرت مولانا کے سینہ کو دیوبندی علوم و فنون کا ایک عظیم الشان کتب خانہ بنا دیا اور آج بغیر کسی خطرۂ تردید کہا جا سکتا ہے کہ مولانا کا وجود اور ان کی علمی شخصیت دارالعلوم کے فیضانِ علمی کا ایک ایسا دلفریب نمونہ ہے جس میں فصلِ بہار کی خوبصورتی، نورستہ غنچوں کا رنگ و نکہت، شفق کی سرخیاں، بادِ شمال کی مستانہ روی، ساون کے مہینہ کی ہلکی پھواریں، شب ماہتاب میں پھیلی ہوئی چاندنی اور دردِ تہ جام کا کیف و خمار، یہ سب کچھ بکثرت موجود ہیں، دیوبندیت اور حضرت مولانا سید مناظر احسن گیلانی ایک ہی حقیقت کے دو نام ہیں، اگر آپ دیوبندیت سے اس کا پردہ ہٹا دیں تو اس کے اندر سے مولانا مناظر احسن گیلانی ہی نکلیں گے اور اگر مولانا مناظر احسن کے فکر و نظر کا تجزیہ کیا جائے تو اس کا حاصل بجز دیوبندیت کے اور کچھ نہیں ہوگا۔

راقم آثم ان حرماں نصیبوں کے گروہ سے تعلق رکھتا ہے جسے اپنی افتادِ طبع کی وجہ سے اہلِ علم حضرات سے ذاتی تقرب و تعلق کا موقع بہت کم ملتا ہے، لیکن میں اپنی ان وارداتِ قلبی کے اظہار پر مجبور ہوں کہ مولانا گیلانی کا تصور میرے لئے لذت بخش، ان کی تحریریں میری فکری الجھنوں کا ایک حل اور ان کی شخصیت میرے خزینۂ محبت کی متاعِ عزیز ہے، میں سمجھتا ہوں

مجھے اپنے اس دعوی میں کافی احتیاط پیش نظر ہے کہ میرے تصورات سے اگر مولانا کی شخصیت کو جدا کرنے کی کوشش کی جائے تو کوشش کرنے والے کو اس میں اتنی ہی صعوبت برداشت کرنی پڑے گی جتنی محبت کرنے اور صرف محبت کے لئے محبت کرنے والے کسی چھوٹے کو اس کے بڑوں اور بزرگوں سے الگ کرنے میں برداشت کی جاسکتی ہے۔

مولانا گیلانی کو جب تک ان کی تحریروں اور تصنیفوں میں دیکھا تو وہ دینی اور عصری علوم کا ایک بحر ذخار نظر آئے، جب ان سے ملاقات ہوئی تو نیکی نیک دلی، سادہ مزاجی، اور جذب و بے خودی کی نیرنگیاں ان میں اس طرح بکھری ہوئی نظر آئیں جس طرح رات کے سینے میں ان گنت تارے آسمان کی بلندیوں پر انگور کے خوشوں اور دانوں کی طرح بکھرے ہوئے نظر آتے ہیں، چہرہ پر علم کی متانت، آنکھوں میں باطنی کمالات کا نور، باتوں میں بلا کی برجستگی اور شستگی، بولنے پر آتے ہیں تو چھوٹے جملوں میں، دبی دبی آواز سے علوم و معارف کی ساری داستانیں کہہ جاتے ہیں۔

حضرت مولانا کی عادت ہے کہ کسی مجلس میں مصروف گفتگو ہوتے ہیں تو ان کی آنکھیں بالکل بند رہتی ہیں اور یا نیم وا، سر بے ارادہ ہلتا رہتا ہے اور مولانا موصوف قلندرانہ اور مجذوبانہ رنگ میں اونچے اونچے حقائق یوں بیان کرتے چلے جاتے ہیں کہ گویا فراز کوہ سے کوئی آبشار بہہ رہا ہو، وہی آبشار کا نغمہ، آبشار کی موسیقی اور آبشار کا سنگیت مولانا کے ساتھ ساتھ چلتا ہے۔

میں اس ملاقات کو بھول نہیں سکتا جب ہم چند دوست ان کی خدمت میں حاضر تھے، میرے برادر محترم مولانا انور صابری نے اپنی ایک تازہ غزل مولانا کو سنائی، مولانا اس سے پہلے علمی گفتگو میں مصروف تھے شعر و شاعری کا قصہ چھڑا اور مولانا انور صابری نے اپنی نغمہ طرازیوں سے

مجلس کے مذاق کا رُخ دوسری طرف پھیر دیا تو مولانا بھی اسی طرف آگئے اور پھر انھوں نے اپنی چند نعتیں، جن میں حبِ نبوی کا سوز، ہندی زبان کا لوچ، حکیمانہ فکر کا تخیل اور غرض کہ سب کچھ تھا ایک خاص محویت کے ساتھ ہمیں سُنائیں۔

مولانا ممدوح سے میرے ذاتی تعلق کا یہ پہلا دن ہے اور اس کے بعد اب عرصہ دراز سے یہ دستور ہے کہ جب مولانا مجھے یاد آتے ہیں تو میں انھیں خط لکھتا ہوں اور مولانا ممدوح کو جب میرا خط ملتا ہے تو وہ اپنی علمی مصروفیات کے باوجود دیر سویر سے ضرور اس کا جواب دیتے ہیں ؛

ایک تابندہ نقش ــــ ایک عظیم رہنما

مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی

(۲)

سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہوگئیں
خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہوگئیں

انگریزوں کا دورِ حکومت اس اعتبار سے تو ہمارے لئے بڑا تکلیف دہ تھا کہ ان کے دورِ حکومت کے سو سال میں ہم ان کی غلامی میں دبے رہے اور ہمارے ہاتھ پاؤں کچھ اس طرح بندھے رہے کہ نہ ہم اپنے دماغ سے سوچ سکتے تھے اور نہ ہمارے ہاتھ پاؤں آزاد تھے کہ کچھ کر سکتے، لیکن اس دورِ غلامی کے شر سے ایک خیر بھی پیدا ہوئی اور وہ یہ کہ انگریزوں کے جور و تشدد اور مکارانہ ڈپلومیسی نے ہندوستان میں مسلمان اور ہندوؤں میں بڑے بڑے شاعر، مقرر، خطیب، قومی رہنما اونچے درجے کے علماء اور ایثار پیشہ کارکن غیر معمولی تعداد میں پیدا کئے۔

قاعدہ ہے کہ انتہائے ظلم سے بغاوت اور درد جب حد سے گذر جاتا ہے تو اس کی دوا پیدا ہو جاتی ہے، یہی کیفیت اس دور میں رہی کہ انگریزوں نے ہندوستانیوں کی ذہنی صلاحیتوں اور دماغی قابلیتوں کو جتنا دبانا چاہا تھا یہ صلاحیتیں اتنی ہی ابھریں، اتنی ہی بڑھیں اور پھیلیں اور ان سب نے

متحدہ محاذ بنا کر انگریز پر پے در پے ایسے شدید حملے کئے کہ اس قوم کو جس کی حدود سلطنت میں سورج غروب نہیں ہوتا، گمنامی و ناکامی کی گہرائیوں میں ڈوب جانا پڑا۔

اس دور کی ایک خاص شخصیت مرحوم مولانا حفظ الرحمٰن کی تھی جو رہنے والے سہوارہ ضلع بجنور کے تھے، مگر ان کی زندگی کا بڑا حصہ دیوبند میں گذرا وہ دار العلوم دیوبند کے فاضل، مشہور عالم و محدث، حضرت علامہ سید محمد انور شاہ کشمیریؒ کے شاگرد تھے، ان کی طالب علمی کا زمانہ بھی دیوبند میں گذرا، پھر وہ دار العلوم کے استاذ کی حیثیت سے بھی ان کا یہاں قیام رہا۔ اخیر میں کم و بیش بیس سال تک وہ دار العلوم کی مجلس شوریٰ کے رکنِ اعلیٰ رہے اور ان رشتوں اور تعلقات میں ان کے بہت سے شب و روز دیوبند میں بسر ہوئے۔

مرحوم بلا کے ذہین، حاضر دماغ، حاضر جواب، مردم شناس، معاملہ فہم، بہترین مجوز و مقرر اور عمل و جد و جہد کے محاذ پر ایک کامیاب سپہ سالار تھے، مختلف نظریات و عقائد کے افراد کو ایک جگہ جمع کرنا اور سب کی خواہشات و افکار پر بڑے تدبر کے ساتھ کنٹرول کر کے انھیں اپنے ڈھب پر لے آنے اور اپنے کاموں پر لگا لینے کا انھیں بڑا سلیقہ تھا۔

اپنوں سے ان کے یہاں لڑائی کا کوئی میدان نہیں تھا، اور ان کی شخصیت اتحاد باہمی کا ایک نشان تھی، ان کا کہنا تھا کہ

"میں قینچی نہیں جو کاٹنا جانتی ہے بلکہ میں تو سوئی ہوں جسے کپڑے کے مختلف ٹکڑوں کو سی کر ایک دوسرے سے ملا دینے کا کام آتا ہے"

ان کا یہ جملہ ان کی پوری زندگی کا صحیح تعارف تھا، واقعی وہ ٹوٹے ہوئے دلوں کو جوڑنے اور منتشر افراد کو ایک جگہ جمع کر دینے کے ماہر تھے

حاضر دماغ اس درجہ کے کہ ادھر آپ نے بات شروع کی، ادھر وہ سمجھے، اور انھوں نے تڑ تڑا تڑ شا یا جواب دیا، دھاں دھاں کر کے بولتے تھے، اور اتنے تیز بولتے تھے کہ بعض وقت تیزی سے بولنے اور درمیان میں سانس نہ لینے کی وجہ سے ان کا چہرہ سُرخ ہوجاتا اور گلے کی رگیں پھول جاتی تھیں مگر اتنا تیز بولنے کے باوجود یہ نہیں ہوسکتا تھا کہ مولانا کی زبان سے کوئی غلط بات، کوئی غلط جملہ نکل جائے۔

ملک کے سچے خادم، پکے جان نثار، ملکی مفاد کے بے لوث محافظ، ان کی جوانی کے خبر نہیں کتنے سال آزادیٔ وطن کی خاطر جیل میں گذرے لیگ و کانگریس کے مقابلہ آرائیوں کے زمانے میں جو مسلمان رہنما مسلمانوں کی نفرت و حقارت کے عرصے تک شکار رہے مولانا ان کی پہلی صف میں تھے

مظلوم مسلمانوں کے غمخوار، ۴۷ء کے فسادات میں نہ صرف دہلی بلکہ سارے ملک میں مسلمانوں کی حفاظت، اجڑے ہوئے مسلمانوں کی آبادکاری اور لٹے ہوئے قافلوں کے قدم جمانے کے لئے ان کی خدمات تاریخ کا ایک ایسا حصہ ہیں جنھیں کوئی بھی مؤرخ بھلا نہیں سکتا۔

بیسیوں قومی، دینی، تجارتی اور رفاہی اداروں کے رکن بلکہ سرپرست تھے، سب کے کاموں پر نظر رکھتے، عملی طور پر سب کو مدد پہنچاتے اور سب کی قیادت و رہنمائی کی حقوق ادا کرتے تھے۔

ذاتی طور پر بے حد ملنسار، نرم دل، خوش خلق، ہنس مکھ، یاروں کے یار اور دوستوں کے دوست تھے۔

انھیں غصہ بہت جلد آتا تھا مگر جتنی جلدی آتا اسی طرح آندھی بگولے کی طرح جلدی نکل جاتا تھا، خوراک بہت کم اور سادہ، لباس معمولی مگر صاف ستھرا، قد لمبا ہونے کے باوجود کچھ ایسا دلفریب کہ شاعر کے اس شعر کے مصداق نظر آتے تھے ؎

سو چمن ندرت کسی کے قد رعنا پر نثار
سرو گلشن اور ہے سرو خراماں اور ہے

ڈاڑھی گھنی، ہاتھ پاؤں طویل، تقریر شستہ و رفتہ، تحریر سادہ مگر دلفریب گفتگو مؤثر، غصہ دلفریب، پیار و محبت کا انداز غیر مصنوعی۔

وہ اپنے بڑوں کی بارگاہ میں پوری طرح مؤدب، چھوٹوں پر شفیق، امیروں کی مشکلات میں ان کے شریک حال، غریبوں کے دکھ درد کے ساتھی، عمل اور کام کا جذبہ اتنا زیادہ تھا کہ اپنے رضا کاروں اور والنٹروں کے ساتھ معمولی کاموں میں حصہ لیتے تھے۔

سب ہی لوگوں کو وہ منظر اب تک یاد ہو گا کہ صدر جمہوریہ کی آمد پر دارالعلوم کے بڑے ہال میں عصرانہ تھا، سیکڑوں بڑی حیثیتوں کے لوگ یہاں موجود تھے مگر مولانا کھانے کی چیزوں کی طشتریوں اور چائے کے سیٹ لپک لپک کر مہمانوں کے سامنے پہنچا رہے تھے، ان میں بالکل اس کا احساس نہ تھا کہ وہ مسلمانوں کے نمائندہ اور قومی جماعت کے سکریٹری، پارلیمنٹ کے ممبر، اور ممتاز قومی رہنما ہیں۔

حضرت شاہ صاحب کی صاحبزادی کو اپنی موٹر میں اسٹیشن سے گھر پر اپنے ساتھ لائے، راستہ میں سڑک پر لکڑیوں کا بڑا سا ڈھیر تھا اس ڈھیر کی وجہ سے گاڑی کا گذرنا مشکل تھا، مولانا فوراً گاڑی سے اترے، دس بیس تیز تیز ہاتھ چلا کر ساری لکڑیاں سڑک کے کنارے پر پھینک دیں اور گاڑی آگے لے آئے

دفتر جمعیۃ میں اپنے غسل کے لئے خود پانی گرم کرتے اور بالٹی میں ڈالکر غسل کر آتے تھے، نہ صرف اپنا کام خود کرتے بلکہ دوسروں کی بھی خدمت کرتے اور دوسروں کے بھی کام آتے تھے۔

سیاسی داؤ پیچ کو خوب سمجھتے تھے، حریف سے آگے بڑھ کر مقابلہ کرتے، مقابلہ میں آخیر تک ڈٹے رہتے اور حریف جس رستہ پر جاتا اسے

ادھر سے روکتے تھے، مگر ان کی ہر لڑائی اور ہر مقابلہ دنائت اور کمینہ پن سے خالی ہوتا تھا، اچانک یا پیچھے سے حملہ کرنے کے عادی نہیں تھے۔

علمی استعداد پختہ، علمی اور دینی مسائل سے لے کر عصر حاضر کی ضروریات تک پر ان کی گہری نظر تھی، بڑے بڑے قانون دانوں کی مجلس میں قانون اور فلسفہ پر گفتگو فرماتے اور سب سے اپنا لوہا منوا لیتے تھے، دلائل گھڑ لینا ان کے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا، کسی بھی مسئلہ پر دلیل کے بغیر بات نہیں کرتے اور اپنی ذہانت سے ہر مسئلہ پر مضبوط دلیلیں نکال لاتے تھے، مسئلہ کے ایک ایک گوشہ کو اس طرح کھولتے تھے کہ حیرت ہو جاتی تھی۔

مولانا کو ہم سے جدا ہوئے کئی سال بیت چکے ہیں مگر سچ یہ ہے کہ قومی اجتماعات، ملی ضرورتوں اور سیاسی محاذ پر اب تک مولانا کا خلا موجود ہے، دلوں میں ان کی یاد باقی ہے اور ان کی یادوں کا ایک ایسا سرمایہ ہے کہ خزانۂ دل اس کے بغیر خالی نظر آتا ہے۔

کچھ شک نہیں کہ بڑا جانباز، سرفروش، بہادر، ایثار پسند، غریب مزاج اور پختہ کردار کا انسان تھا، جس نے اپنی زندگی میں خوب شہرت و مقبولیت پائی اور حقیقی مقبولیت و عزت تو اللہ کے یہاں کی ہے، جس سے یقین ہے کہ ہمارے مولانا نے خوب حصہ پایا ہوگا۔

آؤ! ہم عہد کریں کہ اس جانباز، جری، اور سراپا اخلاص بزرگ کی زندگی کو سامنے رکھ کر اپنی زندگی کو اسی کے سانچے میں ڈھالنے کی کوششیں کریں گے خدا ہمیں توفیق دے۔ آمین ثم آمین۔

حضرت مفتی صاحبؒ
اور
حضرت مولانا انور شاہ صاحبؒ

دل کو روؤں کہ یا جگر کو میرؔ ؛ میری دونوں سے آشنائی ہے

آج سے بائیس تیئیس سال پہلے حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے واقفیت اس ماحول میں ہوئی جو مدرسہ امینیہ دہلی میں حضرت مفتی صاحب اور حضرت مولانا سید محمد انور شاہ صاحب کاشمیری کے نفوس قدسیہ سے قائم تھا، جاننے والے جانتے ہیں کہ اپنے وقت کے ان دو بے مثال عالموں میں گہرے، مخلصانہ اور بے تکلفانہ تعلقات قائم تھے جو اس وقت کی سردی اور گرمی کے باوجود ایک رفتار پر قائم رہے۔ ہر دو بزرگوں کے ان تعلقات کی بنیاد یہ تھی کہ دونوں سیدنا حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کے شاگرد اور از ہر ہند دار العلوم کے فاضل تھے، دونوں مذہبی اور سیاسی عقائد میں فکر و مذاق کی یکسانیت رکھتے تھے، دونوں جمعیۃ علماء کے صف اول کے رہنما تھے، دونوں علم و فضل کے بحر بے کراں کے شناور تھے اور دونوں ایک دوسرے کی علمی و عملی صلاحیتوں اور کمالات کے مرتبہ شناس تھے۔

حضرت علامہ انور شاہ کاشمیری نے اگر "عالم الدین والدنیا" کہہ کر مفتی صاحب کو خراج تحسین ادا کیا اور مختلف مواقع پر ان کے متعلق مدح و تعریف کے وہ کلمات کہے جو اپنے معاصرین میں سے کسی شخص کے متعلق ان کی زبان پر

نہیں آئے تو حضرت مفتی صاحب نے بھی حضرت شاہ صاحب کی رفاقت ودوستی کا حق ادا کیا، ہمیشہ ان کے احترام میں اپنی آنکھیں بچھائیں، ہمیشہ ذاتی معاملات میں انھیں خیرخواہانہ مشوروں سے مستفید فرمایا، مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ حضرت شاہ صاحب کی وفات (جون ۱۹۳۳ء) پر حضرت مفتی صاحب مرحوم نے سہ روزہ "الجمعیۃ" میں خود اپنے قلم سے تعزیتی اداریہ سپرد قلم فرمایا تھا اور اس حادثۂ عظیم پر اپنے دلی تاثرات کا اظہار کچھ ایسے وزنی اور دقیع الفاظ میں فرمایا تھا کہ آج تک میں اپنے قلب ودماغ میں ان کا اثر محسوس کرتا ہوں۔

آج سے پچاس سال پہلے (دارالعلوم دیوبند کے انعامی جلسہ منعقدہ ۱۳۲۵ھ) سے پہلے کی بات ہے، دارالعلوم سے چند نوعمر فاضل نکلے، مولوی امین الدین صاحب، مولوی محمد کفایت اللہ صاحب شاہجہاں پوری، مولوی محمد قاسم صاحب دیوبندی اور محمد ضیاء الحق صاحب۔ ابتداءً ان حضرات نے مختلف مقامات پر کام کیا پھر اس ارادہ سے دہلی میں جمع ہو گئے کہ یہاں ایک مدرسہ قائم کریں گے اور فکر ونظر کی آزادی کے ساتھ دینی اور علمی خدمت انجام دیں گے۔

سنہری مسجد دہلی میں "مدرسہ امینیہ" کے نام سے انھوں نے چھوٹا سا مدرسہ قائم کیا۔ مولوی امین الدین صاحب اس مدرسہ کے مہتمم قرار پائے، مولوی محمد قاسم صاحب اور مولوی ضیاء الحق صاحب مدرس اور مولوی محمد کفایت اللہ صاحب صدر مدرس۔

دہلی میں اس وقت فتحپوری مسجد کا مدرسہ بھی قائم تھا، امینیہ کے قیام کے بعد فتحپوری مسجد کے مدرسہ میں حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی مرحوم، مولانا عبدالسمیع صاحب دیوبندی مرحوم اور مولانا محمد ابراہیم صاحب بلیاوی مدرس بن کر آگئے، مولانا شبیر احمد عثمانی اور مولانا عبدالسمیع صاحب رحلت فرما چکے ہیں، اس قافلہ کے صرف ایک مسافر مولانا محمد ابراہیم صاحب بلیاوی دیوبند میں موجود ہیں انھوں نے ہی حضرت مفتی صاحب کے انتقال کے بعد ہمیں سنایا کہ سنہری مسجد

میں مفتی صاحب کس طرح درس دیتے تھے؟ مولوی امین الدین صاحب مدرسہ کا اہتمام و انتظام کس طرح کرتے تھے اور بے مائگی اور بے سر و سامانی کے باوجود یہ حضرات کس طرح اپنے مقصد پر اکھٹے رہے، انھوں نے کتنی تکلیفیں جھیلیں مگر نہ ایک دوسرے سے جدا ہوئے اور نہ اپنے مدرسہ کو خالص دینی مسلک اور سادہ و صاف زندگی کی راہ سے ہٹایا۔

امینیہ کے قیام کے کچھ عرصہ بعد حضرت مفتی صاحب مرحوم نے حضرت مولانا انور شاہ صاحب کو بھی اپنے پاس بلا یا جو دار العلوم سے فراغت اور سفر حجاز کے بعد قصبہ بارہمولہ (کشمیر) میں مدرسہ "فیض عام" کے نام سے خود اپنا ایک مدرسہ قائم کر چکے تھے اور کامیابی کے ساتھ درس و افتاء اور وعظ و تقریر کی خدمات انجام دے رہے تھے، امینیہ کے پاس اس وقت نہ کوئی عمارت تھی اور نہ چندہ دفتر تھا اور نہ کتب خانہ۔ مطبخ تھا اور نہ دار الاقامہ۔ مگر یہ چند نوخیز علماء جنھیں مستقبل میں رازی و غزالی اور ابن دقیق العید، ابن حجر و ابن ہمام کی حیثیت اختیار کرنی تھی، روکھی سوکھی روٹیوں پر سنہری مسجد میں جمع رہے، دس اور پندرہ روپے ماہوار سے زائد کسی مدرس کی تنخواہ نہیں تھی اور یہ معمولی سی تنخواہ بھی قلت آمدنی کے باعث کبھی کبھی ماہ تک نہیں ملتی تھی۔ آج کے دور میں جب امیرانہ شان و شوکت اور بنگلہ، موٹر، فرنیچر، ریڈیو اور ٹیلیفون کے ساتھ چند تقریریں کرنے اور چند بیانات شائع کرنے کو بہت بڑا ایثار اور بہت بڑی قومی اور ملکی خدمت کہا جاتا ہے، چالیس پچاس سال پہلے کے اس تصور کو کون سمجھ سکتا ہے کہ چند نوجوان جن کی جبینوں میں مستقبل کی عظمت و کامیابی اور عظیم الشان شخصیت کا نور جھلک رہا تھا، روٹیوں سے محتاج، لباس سے محروم، اور ضروریات زندگی کی فراہمی سے مجبور مطلق، بے مائگی اور تہی دستی کے ساتھ سنہری مسجد میں جمع تھے اور دینی علوم کی خدمت کے لئے اپنے دن رات ایک کر رہے تھے۔

مظفر نگر میں حکیم فتح محمد خاں صاحب، حضرت شاہ صاحب کی اس زندگی کے ایک شاگرد اب تک موجود ہیں، علاج کے سلسلہ میں کئی دفعہ حکیم صاحب کے پاس جانے کا اتفاق ہوا، اور اس دور کے کچھ حالات ان سے بھی سنے، حکیم صاحب کی یہ بات مجھے نہیں بھولتی کہ" اس وقت ادب عربی اور فنون میں ڈپٹی نذیر احمد صاحب کی قابلیت مسلّم تھی اور دہلی میں انہی کا ڈنکا بجتا تھا، میں شرح چغمینی پڑھنے کے ارادہ سے ان کی خدمت میں حاضر ہوا، مگر انھوں نے پیرانہ سالی کی وجہ سے اس محنت سے معذوری ظاہر کی، حکیم صاحب کہتے تھے کہ پھر میں سنہری مسجد میں شاہ صاحب کے پاس گیا اور یہ کتاب انہی سے پڑھی"۔

حضرت شاہ صاحب چند سال امینیہ میں رہے، پھر اپنے استاد حضرت شیخ الہندؒ کے ارشاد اور مولانا حافظ محمد احمد صاحب اور مولانا حبیب الرحمٰن عثمانی کی تجویز پر دارالعلوم میں تشریف لائے مگر مفتی صاحب سے آخر دم تک بہترین تعلقات قائم رہے، حضرت شاہ صاحبؒ اپنی وفات سے ۸ سال پہلے دارالعلوم سے جدا ہو کر جامعہ اسلامیہ ڈابھیل تشریف لے گئے تھے۔ اس ہجرت میں مولانا مفتی عزیز الرحمٰن عثمانی، مولانا شبیر احمد صاحب، مولانا محمد حفظ الرحمٰن صاحب، مولانا مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی، حضرت شاہ صاحب کے ہم قدم تھے، ڈابھیل آتے جاتے ہوئے حضرت شاہ صاحب ایک دو روز امینیہ میں مفتی صاحب کے پاس ضرور قیام فرماتے تھے، یہ بات آج سے بیس بائیس سال پہلے کی ہے مگر تصور کی نگاہ اس منظر کو اب بھی دیکھ رہی ہے کہ صبح ۱۰ بجے حضرت شاہ صاحب کشمیری دروازہ میں امینیہ کی عمارت کے سامنے تانگہ سے اترے اور بڑی بے تکلفی کے ساتھ مدرسہ کے مہمان خانہ میں تشریف لے گئے، حضرت شاہ صاحب کے ساتھ ۸-۱۰ سال کی عمر کا ایک بچہ بھی تھا، مدرسہ کی بالائی منزل پر اپنے ایک کمرہ میں کتابوں اور کاغذوں کے ڈھیر میں عینک لگائے ایک صاحب کو بیٹھے دیکھا قریب پہنچا تو یاد آیا کہ ابھی ایک دو سال پہلے انجمن خدام الدین لاہور کے جلسہ میں

ان صاحب نے تقریر بھی کی تھی، ان صاحب سے کسی نے کہا کہ ذرا انہیں اطلاع تو دو پر خبر ہی کہ حضرت شاہ صاحب تشریف لائے ہیں۔ بڑے شوق و محبت کے ساتھ یہ صاحب اٹھے اور مہمان خانہ میں آکر شاہ صاحب سے برادرانہ بے تکلفی مگر کمال متانت و سنجیدگی کے ساتھ ملے، دوپہر کا کھانا مفتی صاحب کے لئے گھر سے آتا تھا، مگر شاہ صاحب کی مہمانداری امینیہ میں ہوتی تھی اور مہمانخانہ ہی میں کوئی صاحب کھانا تیار کرتے اور دونوں دوست جمع ہو کر کھانا کھاتے۔

شاہ صاحب کو اپنی ذاتی معاملات میں مفتی صاحب کی رائے پر اعتماد کامل تھا، اپنے گھر کی ضروری باتیں بھی مفتی صاحب سے فرماتے اور ان سے مشورہ لیتے۔ کسی موقعہ پر شاہ صاحب کی اہل خانہ نے اپنی بچیوں کے لئے کچھ زیور اور کپڑے مہیا کرنے کی فرمائش کی، اچھی طرح یاد ہے کہ دہلی پہنچکر حضرت شاہ صاحب نے مفتی صاحب سے اس کا ذکر فرمایا اور ان کا دانشمندانہ مشورہ حاصل کیا۔

دیوبند میں حضرت مفتی صاحب ایک دفعہ حضرت شاہ صاحب کے گھر پر تشریف فرما تھے، مکان سے متصل شاہ صاحب کی ایک افتادہ زمین تھی وہاں لیجاکر مفتی صاحب سے پوچھا کہ حضرت یہاں ایک چھوٹا سا مکان مہمانوں کیلئے بنانے کا ارادہ ہے! مفتی صاحب نے انکار فرمایا اور شاہ صاحب نے پھر کبھی اس ارادہ کا اعادہ نہیں کیا، ان واقعات سے دونوں کے باہمی تعلقات کی پختگی کا اندازہ کیجئے۔

میں نے ابھی عرض کیا تھا کہ حضرت شاہ صاحب آخر زندگی میں بعض انتظامی مسائل میں اختلاف کی وجہ سے دارالعلوم سے الگ ہو کر ڈابھیل تشریف لے گئے تھے، جن مسائل میں انھیں ذمہ دارانِ دارالعلوم سے اختلاف تھا ان میں ایک یہ بھی تھا کہ دارالعلوم کی مجلسِ شوریٰ میں کارگذار ارکان جمع کئے جائیں، حضرت شاہ صاحب نے حضرت مفتی صاحب حضرت مولانا سید

حسین احمد صاحب مدنی مدظلہٗ اور حضرت مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی کو ممبری میں لینے کا واضح الفاظ میں مطالبہ فرمایا تھا، حضرت مفتی صاحب اپنے اعتدال فکر، سنجیدگی و متانت، حق گوئی اور مختلف الخیال افراد کو باہم جمع کر لینے کی صلاحیت میں مشہور ہیں، ان کی ان صفات کا بڑا اچھا مظاہرہ دارالعلوم دیوبند کے اس زمانۂ اختلاف میں ہوا جس کا میں ذکر کر رہا ہوں، ایک طرف حضرت مولانا حافظ محمد احمد صاحب اور مولانا حبیب الرحمٰن عثمانی سے بھی ان کے تعلقات تھے اور دوسری طرف حضرت شاہ صاحب اور ان کی جماعت کے بھی وہ معتمد تھے، اختلافات کے اس زمانہ میں کئی بار دیوبند تشریف لائے، معاملات کو سنبھالنے کی کوشش کی اور کئی دفعہ بڑے ہولناک فتنوں کو اپنے تدبر و تفکر سے پیچھے ہٹا دیا۔ مگر معاملات میں جانبداری کی بو کبھی پیدا نہیں ہوئی، خالص تعمیری نقطۂ نظر سے دارالعلوم کے مفاد کی حفاظت فرمائی، شخصیات سے کبھی اپنا دامن آلودہ نہیں ہونے دیا، اور پھر دو مخالف طاقتوں سے اس طرح نباہ کی کہ حق گوئی کے باوجود دونوں کی نگاہ میں معزز و مکرم رہے دنیاوی معاملات کا تجربہ رکھنے والے حضرات سمجھ سکتے ہیں کہ دو فریقوں کے درمیان حق گوئی کے ساتھ اپنی آزادانہ اور غیر جانبدارانہ رائے کو محفوظ رکھنا اور پھر دونوں کی نگاہ میں مقبول رہنا کتنا مشکل کام ہے۔

مجھے یاد نہیں کہ یہ ملتان کی اسارت کے وقت کا واقعہ ہے یا گجرات کا بہرحال حضرت مفتی صاحب نے تحریک کشمیر کے سلسلہ میں کشمیر کے مظلوم مسلمانوں کی امداد کے لئے رنگون سے آئی ہوئی ایک امدادی رقم ان کے پاس جو کئی ہزار پر مشتمل تھی، جیل جانے سے پہلے حضرت مفتی صاحب نے اپنے صاحبزادہ مولانا حفیظ الرحمٰن واصف کو دے کر تاکید فرمائی کہ یہ رقم حضرت شاہ صاحب کے پاس منتقل کر دی جائے وہ اس کے مصرف میں اسے خرچ کریں گے، اور واصف صاحب نے حکومت کی قید و بند سے بچا بچا کر آہستہ آہستہ یہ رقم

حضرت شاہ صاحب کو بھیجدی۔

یہ واقعہ بہت پرانا ہے مگر بعض واقعات حافظہ میں اپنا اتنا گہرا اثر چھوڑ جاتے ہیں کہ ماہ وسال کی گردشیں ان کی تر وتازگی کو فنا نہیں کر سکتیں دیوبند میں ملتان سے کھلا ہوا حضرت مفتی صاحب کا ایک کارڈ آیا کہ میں کل شام جیل سے رہا کر دیا گیا ہوں، اور دہلی روانہ ہو رہا ہوں، پرسوں صبح دہلی پہنچوں گا۔ یہ سطریں حضرت شاہ صاحب کے لئے ایک پیغام مسرت ثابت ہوئیں، وسیع علمی مشاغل اور بے حد سنجیدگی ووقار کے باوجود مسکراہٹ ان کے چہرے پر کھیل گئی۔ فرط مسرت سے غنچۂ نورس کی طرح کھل کھل گئے تیسرے دن دہلی تشریف لے گئے اور امینیہ کے دروازہ پر علم وفضل کے یہ دو سرمایہ دار پر تپاک طریقہ پر ایک دوسرے سے ملے۔

حضرت مفتی صاحب نے عمر بھر کے ان تعلقات کی رواداری اس حد تک فرمائی کہ ۱۹۴۷ء سے پہلے حضرت شاہ صاحب کا چھوٹا بچہ "انظر" جب دہلی گیا تو اس کے تمام مصارف واخراجات کا انتظام مفتی صاحب نے فرمایا ہر ماہ اپنے پاس بلا کر خرچ کے لئے ضروری رقم عنایت فرماتے اور قدم قدم پر اس کی اصلاح وتربیت کا خیال رکھتے، دیوبند واپسی پر جب کبھی انظر نے انھیں دہلی خط لکھا تو واپسی ڈاک سے جواب عنایت فرمایا، اس کی والدہ محترمہ صاحبہ اور سب گھر والوں کی خیریت اور حالات دریافت فرماتے اور پوری خبر گیری کرتے۔

دنیا کی بے ثباتی اور فنا پذیر طریقہ رفتار اور ان دردناک سانحات کی کثرت نے آنکھوں سے آنسو بھی خشک کر دیئے ہیں۔ کہنا چاہیے کہ دل بالکل مر گیا ہے حوصلہ اور شوق ختم ہو گیا ہے، اب نہ جینے کی آرزو ہے اور نہ اسباب زندگی جمع کرنے کا شوق، بزرگوں کے زیر سایہ زندگی کی آنکھ کھولی اور جوانی کا قدم اٹھایا تھا، جن کے دامن علم وفضل پر ہمارے بچپن نے شوخیوں کی اجازت پائی تھی

اور جن کے تفریحی کلمات حوصلہ افزا اور محبت آمیز لفظوں سے ہم بے شعوروں، ناسمجھوں اور نامرادوں نے کام کرنے کے ولولے حاصل کئے تھے، آج ان میں سے کتنے نکہت گل کی طرح فضائے چمن میں بکھر کر رہ گئے ہیں، کتنے شہاب ثاقب کی طرح آسمان سے نیچے گر کر ٹوٹ گئے ہیں، کتنے شمع سحر بن کر بجھ گئے ہیں، کتنے آفتاب سر کوہ کی طرح ڈوب گئے ہیں، اپنا سب کچھ لٹ جانے کے بعد بھی اگر انسان اپنے دل کو زخمی اور مجروح نہ پائے تو اور کیا ہو؟ سچ کہا ہے حفیظ جالندھری نے کہ ؎

احباب ہی نہیں ہیں تو کیا زندگی حفیظؔ!
دنیا چلی گئی مری دنیا لئے ہوئے

آج دل غمزدہ اپنے بزرگوں کے مزارات پر ہجر و فراق کے آنسو بہا رہا ہے، نگاہیں ایثار و تقویٰ کے ان بلند مناروں کو ڈھونڈتی ہیں جن کی بدولت اس آتش زار حیات میں سایہ تھا، چھاؤں تھی، خنکی تھی اور راحت تھی ادھر حضرت مولانا انور شاہ کا علم و فضل یاد آتا ہے، ادھر مولانا شبیر احمد عثمانی کی رعد آسا آواز کانوں میں گونجتی ہے اور مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ مفتی صاحب اب تک ہمارے درمیان ہی موجود ہیں۔

دارالعلوم کے جلسۂ شوریٰ میں اب پھر کسی قریبی تاریخ میں وہ مولانا حفظ الرحمٰن اور مولانا مفتی عتیق الرحمٰن کے ساتھ ان کی کار میں تشریف لائیں گے کار دارالعلوم کے احاطہ میں آکر رکے گی اور مفتی صاحب اپنے پروقار انداز میں لمبے لمبے قدم زمین پر رکھتے ہوئے میرے دفتر کے سامنے سے گذر کر دارالمشورہ میں تشریف لے جائیں گے۔

ہائے! موت کے سخت گیر ہاتھ نے ہم سے بہت بڑی دولت چھین لی ایک ایسا شخص ہم سے جدا ہو گیا جس نے معمولی سی چٹائی پر بیٹھ کر دین و شریعت کے مسائل سلجھائے، حکمت و سیاست کی گرہیں کھول دیں، معاملات کی

پیچیدگیوں کو سلجھا دیا، جو خاموش رہ کر صرف اپنے شخصی اثر اور ذاتی وجاہت سے مسائل کو ان کی اصل ضرورت کے معیار پر حل کرا لیتا تھا۔

حق تعالیٰ ان سے راضی ہو کر انھوں نے اللہ کے دین کے لئے بڑی محنت کی، اور پرایوں سے نہیں اپنوں سے بھی

"اَبّا جی اور شاہ جی"

زباں پہ بارِ خدایا یہ کس کا نام آیا

مجھے بڑے لوگوں سے ان کی غائبانہ شہرت کی بنا پر عقیدت و محبت کے تعلقات قائم رکھنے کا سودائے خام کبھی نہیں ہوا اور نہ کبھی ایسا ہوا کہ میرے شہر میں کوئی بڑا لیڈر یا بڑا شاعر اور قومی کارکن آیا ہو اور میں شوقِ تعارف و ملاقات میں اس کی جائے قیام کے ارد گرد گھومتا رہا ہوں۔ وجہ یہ ہے کہ میرے نزدیک غائبانہ شہرت اور اس شہرت کی ہمہ گیری کسی انسان کی بڑائی اور بھلائی کا معیار نہیں۔ بڑائی صرف اخلاق کے لئے ہے اور بڑا آدمی وہ ہے جس کے اخلاق معیاری اور بلند ہوں۔

میرا تجربہ ہے کہ بعض بداخلاق اور بے کمال انسان بھی بعض وقتی حوادث سے شہرت پا لیتے ہیں؛ لیکن ان کے قریب جاکر جب ان کے کردار کے کچھ گوشوں کو ٹٹولئے تو ان میں اچھے اعمال و اخلاق کا کوئی سرمایہ نظر نہیں آتا۔ یہی وجہ ہے کہ شعرا میں جگرؔ، احسانؔ، جوشؔ، سیمابؔ۔ اہلِ صحافت میں مولانا ظفر علی خاں، سالکؔ مرحوم، حامد الانصاری غازی، محمد عثمان فارقلیط قومی رہنماؤں میں سید عطاء اللہ شاہ بخاری، مولانا حبیب الرحمٰن، مولانا حفظ الرحمٰن۔ اربابِ علم و فضل میں مولانا شبیر احمد عثمانی، مولانا مناظر احسن گیلانی، مولانا محمد طیب صاحب، مولانا احمد علی وغیرہ سے زائد کسی سے میرا تعارف اور تعلق نہیں۔ بڑے آدمیوں کے تعارف و تعلق کے مجھے بہت سے

مواقع ملے مگر شاید آپ اس پر اعتبار نہ کریں کہ میں نے خود ان مواقع کو کھو دیا اور کبھی ہر کس و ناکس سے رشتۂ محبت و عقیدت استوار کرنے کی مجھے ہمت نہ ہوئی۔

صفِ اول کے لوگوں میں گاندھی جی اور جواہر لال تک میرے قریب سے گرج برس کر گذر گئے، لیکن میں نے ذاتی طور پر ان سے تعلق پیدا کرنے میں خود اپنا نقصان سمجھا اور ان بزرگوں میں سید عطاء اللہ شاہ بخاری سے میرا تعلق بہت قدیم مستحکم اور نیاز مندانہ رہا ہے۔ مجھے یاد نہیں کہ انجمن خدام الدین لاہور کا وہ جلسہ جس میں شاہ جی کو امیر شریعت بنایا گیا تھا، اور میرے والد مرحوم کی تائید کے ساتھ پانچ سو علماء کی ایک جماعت نے ان کے ہاتھ پر بیعت کی تھی۔ کس سن میں ہوا تھا کہ یہ سن اور تاریخ یاد رکھنے کا جھگڑا میرے بس سے باہر ہے، بہر حال اس جلسہ میں میں نے شاہ جی کو دیکھا، یہ بیس بائیس برس پہلے کی بات ہے، شاہ جی ان دنوں جوان تھے سرخ و سپید چہرہ، بھرے بھرے بازو، چہرے پر جلال، بدن میں چستی نگاہوں میں چمک، سر پہ شاہ جی نے سادہ کپڑے کی گول ٹوپی پہن رکھی تھی، گلے میں رنگین قمیص، قمیص کی آستین صرف بازوؤں تک، پاؤں میں چپل ہاتھ میں موٹا سا ڈنڈا، رات کو اسٹیج پر میں، مولوی عبدالحنان صاحب کے پاس پڑا سو رہا تھا کہ کسی شخص کی دھواں دھار تقریر سے میری آنکھ کھل گئی، یہ ہمارے شاہ جی تھے جو انجمن خدام الدین کے جلسہ میں تقریر کر رہے تھے صبح ڈاکٹر عبدالقوی صاحب کے یہاں ان سے تفصیلی ملاقات ہوئی، مجھے اس دن بخار تھا، ابا جی نے منع کیا کہ صرف چائے پی لینا، چائے کے علاوہ کوئی اور چیز نہ کھانا، مگر شاہ جی انڈے چھیل چھیل کر میری طرف بڑھاتے رہے اور میں کھاتا گیا، شاہ جی سے اس پہلی ملاقات کے بعد خلاف عادت میں بہت متاثر ہوا، یقین جانئے کہ کئی برس تک اس بچپن کے عالم میں میرا یہ

حال رہا کہ بالکل شاہ جی کی طرح جپی پہنتا رہا، ایسی ہی ٹوپی اوڑھتا، ایسا ہی موٹا سا ڈنڈا لئے پھرتا اور جامعہ اسلامیہ ڈابھیل کی مسجد میں سیکڑوں دفعہ طلباء کو گھیر گھار، ان کے سامنے شاہ جی کے لب و لہجہ میں اول فول تقریریں بکا کرتا۔

شاہ جی سے مجھے محبت زائد اس وجہ سے ہوئی کہ میرے والد مرحوم فطرۃً بہت خاموش، دنیا داری سے بالکل الگ، ملنے ملانے سے نفور اور تعلقات میں ایک زبردست معیار کے انسان تھے، بڑے سے بڑے انسان کے لئے بھی یہ مشکل تھا کہ وہ اباجی کو متاثر کر سکتا اور ان سے تعریف و تحسین کے دو کلمے پا لیتا۔

آپ نے سُنا ہو گا کہ سنہ ۳۱ء یا سنہ ۳۲ء میں گاندھی جی نے میرے والد مرحوم سے ملاقات کی خواہش ظاہر کی، مگر انھوں نے یہ کہہ کر ٹال دیا کہ "میں گوشہ نشین فقیر، لیڈروں سے ملنے کا سلیقہ نہیں رکھتا۔"

نظام حیدر آباد نے انھیں گھیر گھار کر اپنے یہاں بلایا، کہتے ہیں کہ نظام ترجمہ قرآن کے سلسلہ میں اباجی سے کوئی علمی خدمت لینا چاہتے تھے، اور اس کام کے لئے لاکھوں روپیہ خرچ کرنے کے لئے تیار تھے، مگر اباجی نے کہا کہ "میں پیسہ لے کر قرآن کی کوئی خدمت کرنے کا ارادہ نہیں رکھتا۔ آپ اس کام سے مجھے معذور سمجھیں، آپ سمجھ سکتے ہیں کہ ایسے غیر ملنسار اور غیر دنیا دار آدمی کا کسی سے متاثر ہونا واقعی مشکل تھا مگر اباجی، شاہ جی کے سو جان سے دیوانے تھے، ہر وقت شاہ جی کا کلمہ پڑھتے، ہر وقت انہی کا حال پوچھتے۔ کتاب سے فراغت ہوئی چارپائی پر سنبھل کر بیٹھ گئے، سادہ چائے آئی، اس کا دور چلا۔ سامنے میرے ماموں جناب حکیم سید محفوظ علی صاحب یا مولانا حفظ الرحمٰن، مولانا محمد ادریس صاحب، مولانا عتیق الرحمٰن صاحب ہوئے اور اباجی نے سلسلۂ کلام شروع کر دیا۔

کیوں مولوی صاحب! ہم عطاء اللہ شاہ کو اگر سب کاموں سے ہٹا کر صرف تردید قادیانیت پر لگا دیں تو یہ کیسا رہے ۔ مولوی صاحب! یہ صاحب واقعی مخلص ہیں، بہت محنتی اور بہت زیادہ بہادر، انھوں نے پنجاب میں چند تقریریں کر کے قادیانیت کے خلاف ایک عام جذبہ پیدا کر دیا ہے، ہم سمجھتے ہیں کہ اگر انھوں نے اسی طرح محنت سے کام کیا تو قادیانیت انشاء اللہ ختم ہو جائے گی ۔

جن دنوں انجمن خدام الدین کے جلسہ میں ابا جی نے شاہ جی کے ہاتھ پر بیعت کی ان دنوں شاید اخبار انقلاب لاہور میں ایک نظم نکلی تھی جسے اس زمانہ کے مشہور اخبار سیاست نے بھی خوب مزے لے کر چھاپا تھا، اس کے پہلے چند اشعار میں تو نمک کے محصول کے سلسلہ میں ابا جی کے ایک مشہور فتوی کا مذاق اڑایا تھا، اور اس فتوے کا اس زمانہ میں اس وجہ سے بہت چرچا ہو گیا تھا کہ گاندھی جی نے اس فتوے کو سامنے رکھکر نمک سازی کی اپنی مشہور تحریک شروع کی تھی ۔ نظم کے چند شعر تھے کہ ؎

چھپ گیا اخبار میں فتوی یہ انور شاہ کا
پہلے نعرہ اوم کا زاں بعد الا اللہ کا
یعنی گاندھی بھی ہے ملکِ ہند کا شیخ الحدیث
ماننے والا ہے وہ قولِ رسول اللہ کا
سبحۂ و زنار کے رشتہ میں کچھ وحدت بھی ہے
مل گیا بت خانہ سے ٹکڑا حرم کی راہ کا
اب بتایا جا رہا ہے دونہ محصولِ نمک
حکم گاندھی کا اشارہ ہے رسول اللہ کا

اس نظم میں ابا جی کی بیعت کا ذکر یوں کیا گیا تھا کہ ؎

کی ہے اک شاگرد کی استاذ نے بیعت قبول ؛ بڑھ گیا ہے مہر سے کس درجہ رتبہ ماہ کا

انقلاب آسماں دیکھو کہ اک ادنیٰ مرید ؛ پیر انور شاہ جیسا ہے عطاء اللہ کا

اور بادی النظر میں یہ بات واقعی حیرت انگیز تھی کہ اباجی، شاہ جی کی بیعت کریں۔ مگر یہاں "میانِ عاشق و معشوق رمزیست" کا معاملہ تھا، کسی کو کچھ پتہ نہیں چلا کہ مرید نے مرشد میں کیا جوہر دیکھے اور کیوں اس کے ہاتھ پر بیعت کی، ہم تو صرف اتنا جانتے ہیں کہ شاہ جی کا نام آیا اور اباجی کے چہرہ پر مسکراہٹ کھیل گئی، کسی نے شاہ جی کی تعریف کی تو خوش ہو گئے کسی نے شاہ جی کو برا کہا تو بگڑ گئے۔

اباجی کو اخبار پڑھنے کی کبھی عادت نہ تھی مگر صرف شاہ جی کی خبریں معلوم کرنے کے لئے اخبار پڑھنے والوں سے جب خیال آجاتا تو پوچھتے کہ بھائی شاہ جی کی کوئی خبر ہے؟ کہیں تقریر کی یا نہیں؟ کہاں ہیں؟ ادھر دیوبند کی طرف تو آنے کی خبر نہیں؟

اللہ اللہ محبت و شفقت کا کیا عالم تھا، ایک دفعہ اسی طرح مجھ سے پوچھ رہے تھے کہ آج اخبار میں شاہ جی کی کوئی خبر تھی کہ نہیں؟ میں نے جھنجلا کر کہا کہ کوئی نہیں؟ فرمایا کہ الجمعیۃ بھی دیکھا تھا یا نہیں؟ میں نے کہا دیکھا تھا، اس میں بھی کوئی خبر نہیں تھی، ارشاد ہوا کہ اور زمیندار؟ میں اس کھود کرید سے تنگ آگیا تھا، ہنس کر بولا کہ جی اس میں خبر تھی کہ شاہ جی گرفتار ہو گئے۔ میری آنکھوں کے سامنے اٹھارہ انیس سال پہلے کا یہ نقشہ جوں کا توں موجود ہے، اس طرح کہ گویا یہ واقعہ آج ہی ہوا ہے، اباجی چارپائی پر اپنے کھدر کے بستر پر لیٹے ہوئے تھے، یہ سنتے ہی اٹھ بیٹھے، گھبرا کر پوچھا کہ گرفتار ہو گئے! کہاں گرفتار ہو گئے؟ بھائی! کیا معاملہ ہوا، ذرا تفصیل سناؤ، ان کے گھبرا کر اٹھ بیٹھنے اور اس طرح سوالات کرنے سے مجھے احساس ہوا کہ میرا یہ جھوٹ اباجی کے لئے بدرجۂ غایت تکلیف دہ ہو گا، یہاں تو محض دفع الوقتی کے لئے جھوٹ بولا تھا!

مگر اب یہ جھوٹ جان لے کر رہے گا، پریشان ہوا کہ آخر کیا کروں، اور دل نے فوراً یہ فیصلہ کیا کہ اس شاندار جھوٹ کو واپس لے لینے ہی میں عافیت ہے میں نے عرض کیا کہ میں تو ویسے ہی مذاق میں کہہ رہا تھا، شاہ جی کہیں گرفتار نہیں ہوئے، ۱۴ مئی کو دہلی میں جلسہ ہے شاہ جی اس جلسہ کی شرکت کے لئے دہلی آنے والے ہیں۔

بے ساختہ فرمانے لگے کہ نعوذ باللہ جھوٹ کسی ضرورت اور حاجت سے بولا جاتا ہے، آپ کچھ عجیب طرح کے آدمی معلوم ہوتے ہیں، بظاہر یہ جھوٹ بولنے میں آپ کا کوئی نفع نہیں تھا، مگر آپ نے بے ساختہ جھوٹ بولا گویا آپ ضرورتاً نہیں بلکہ عادۃً جھوٹ بولتے ہیں، حق تعالیٰ آپ کو ہدایت فرمائے، آپ کو نیک عمل کی توفیق دے، آپ کا حال تو ہمارے نزدیک بہت افسوسناک ہوتا جا رہا ہے۔

شاہ جی ایک دفعہ دیوبند تشریف لائے، مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی ساتھ تھے اور قیام ہمارے ہی مکان پر تھا۔ میں ذمہ داری کے ساتھ یہ بات کہہ سکتا ہوں کہ ہم جس مکان میں اب مقیم ہیں اس مکان میں بھی اباجی سات سال تک ہمارے ساتھ رہے، مگر اس سات سال کے عرصہ میں صرف ایک مرتبہ یہ موقع آیا کہ اباجی گھر کے باورچی خانہ میں تشریف لائے، صرف ایک مرتبہ، اور یہ موقع وہی تھا جب شاہ جی ہمارے مہمان تھے، اباجی نے باہر سے آتے ہی والدہ کو آواز دی، وہ باورچی خانہ میں تھیں، آواز کا جواب نہ دے سکیں، جلدی سے اباجی باورچی خانہ میں تشریف لے آئے۔ اماں۔ سے فرمانے لگے کہ ارے سنتی ہو آج ہمارے ایک بہت معزز مہمان آیا ہے، بہت زیادہ معزز، اس کی تواضع اور مہمانداری بہت اچھی طرح کرنی چاہیئے، ابھی کسی ہمسائے کے یہاں سے ایک دو مرغ منگواؤ، ان کا شوربا پکاؤ، چاول پکاؤ، کوئی میٹھی چیز بھی

پکالو، شام کو بڑے سلیقہ اور فراغت سے مہمان کو کھانا کھلاؤ۔"

آپ لوگوں کے نزدیک یہ کوئی اہم بات نہ ہوگی، کہ ہر شخص اپنے مہمانوں کی تواضع کرتا اور ان کی مدارات کے لئے مختلف اہتمام کرتا ہے مگر اباجی کا معاملہ عام لوگوں سے الگ تھا، ان باتوں اور جھگڑوں سے ان کی بے تعلقی کا یہ عالم تھا کہ میں نے قرآن شریف ناظرہ سے شروع کر کے پورا حفظ کر لیا، اور اس میں مجھے دو تین سال لگے، مگر اباجی کو اس ساری مدت میں یہ نہ معلوم ہوا کہ اظہر کیا پڑھتا ہے، جس دن میں قرآن کے حفظ سے فارغ ہوا، اسی دن مولانا سراج احمد صاحب رشیدی مرحوم نے جو اباجی مرحوم کی مجلس علمی کے ایک ممتاز رکن اور اپنے وقت کے بڑے عالم تھے انھوں نے اباجی کو مبارک باد دی۔ فرمانے لگے یہ تو ہماری توقع اور علم کے بغیر ایسا ہو گیا ہے، ہمیں اس کا کوئی علم نہیں تھا کہ اظہر حفظ کر رہا ہے اور حفظ بھی اب تمام ہو گیا ہے۔" آپ اندازہ کیجیے کہ جس شخص کو دنیاداری سے اتنی بے تعلقی ہو، شاہ جی کے حال پر اس کا یہ التفات، یہ محبت اور یہ توجہ قابل ذکر چیز ہے یا نہیں؟

شاہ جی کا تعارف اباجی سے مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی نے کرایا تھا، وہی اس آزاد منش، رند پارسا کو گھیر گھار کر اباجی کے پاس لائے اور پھر مدۃ العمر دونوں ان کی بارگاہ میں مقبول رہے۔

قادیانیت کے سلسلہ میں شاہ جی نے جتنا کام کیا سب اباجی کے اشارہ و ارشاد پر، شاہ جی کی تقریریں پسند کی جاتیں تو اباجی کا سیروں خون بڑھتا۔ وہ تردید قادیانیت کے لئے لمبے لمبے دورے کرتے تو اباجی کی نگاہ ان کے ہر قدم پر رہتی۔ ڈابھیل میں مسجد مدرسہ میں ان کا معمول تھا کہ جمعہ کو تقریر فرمایا کرتے، ایسی تقریر جس میں صرف مغز مغز ہوتا تھا، الفاظ بالکل نہیں، نہ کوئی ابتدا ہوتی تھی اور نہ انتہا، تقریر ختم کر چکے مجمع

اٹھ گیا، خود منبر سے اتر آئے مگر کوئی بات پھر ذہن میں آگئی تو دوبارہ پھر منبر پر جا بیٹھے اور تقریر شروع فرمادی۔ ایک دن خطبۂ مسنونہ کے بعد صرف یہی مضمون بیان ہوا کہ پنجاب میں ایک صاحب ہمیں مل گئے ہیں، صاحب توفیق صاحب صلاحیت، صاحب سواد، خوب کام کرتے ہیں، مولویوں کی طرح نہ خواہش زر میں مبتلا ہیں اور نہ خواہش شہرت میں، بس بے چارہ محض اللہ کے لئے کام کئے جاتے ہیں۔ ہم نے قادیانیت کے متعلق انھیں توجہ دلائی کہ یہ فتنۂ عظیم صحیح اسلام کو جڑ سمیت اکھاڑ پھینکنے کا ارادہ کر بیٹھا ہے، آپ کیوں نہ اس فتنہ کے خلاف کچھ کام کر گذریں۔ آپ کا وہ کام دین میں آپ کیلئے نفع رساں ہوگا اور دنیا میں اس سے اہل دین کو فائدہ پہنچے گا، یہ کہہ کر پھر شاہ جی کا نام لیا۔ فرمایا کہ بڑوں بڑوں سے جو کام نہ ہوا، وہ اس غریب نے کر دکھایا (طلبا کی طرف اشارہ کر کے فرمایا) آپ تو مدرسہ کی روٹیاں کھا کر ہر وقت بحث و مباحثہ میں لگے رہتے ہیں۔ دین کی کوئی محبت آپ حضرات کے دل میں نہیں، عطاء اللہ شاہ اگر یہاں آگئے تو آپ ان سے ملئے، وہ عجیب آدمی ہیں۔

میرے خیال میں اباجی کے انہی الفاظ کو سامنے رکھ کر حفیظ جالندھری نے ایک دفعہ کہا تھا کہ دورِ اول کے مجاہدینِ اسلام کے گروہ سے ایک سپاہی راستہ بھول کر اس زمانہ میں آنکلا ہے، وہی سادگی، مشقت پسندی، بکیر عمل، اخلاص اور للٰہیت جو ان میں تھی وہ عطاء اللہ شاہ میں بھی ہے۔

ڈابھیل میں فیض اللہ مئوی کے نام سے ایک طالب علم تھے، اباجی کے یہاں ان کی رسائی صرف اس وجہ سے تھی کہ وہ شاہ جی کی شان میں اپنی اٹمل اور بے جوڑ نظمیں بڑے بے ہنگم لہجہ میں پڑھ کر سناتے تھے، اباجی ہمیشہ اس طالب علم پر توجہ کرتے اس کی مدارات فرماتے اور ہر جگہ اسے

یاد رکھئے، اور میرے عزیز بھائی!
یہ قصہ ہے جب کا کہ آتش جوان تھا۔

جن بزرگوں کے یہ قصے ہیں وہ بزرگ اب مدت ہوئی نظروں سے ایک جلوۂ بے قرار کی طرح اوجھل ہو گئے، زمانہ بدل گیا، مجلسوں کا رنگ کچھ اور ہے، بحث و مباحثہ اور ذکر و نظر کا موضوع یکسر جدید ہے، پچھلی باتوں میں نئے زمانہ کے لئے کوئی دلچسپی نہیں، وہ بزرگ اپنے اپنے وقت پر علم و فضل کے آفتاب و ماہتاب بن کر چمکے، مگر آج تو خاک مزار کے سوا ان کا کوئی نشان نہیں ملتا، پہلے کبھی ابا جی کی مجلس میں حقائق دین کی گرہیں کھلتیں اور ذکر و نظر کے نئے سانچے تیار ہوتے تھے، جن پر ان کی نظر پڑ جاتی تھی وہی کام کا آدمی بن جاتا تھا، جو قدموں میں آ کر بیٹھتا تھا وہی کچھ لے کر جاتا تھا، مگر آج ان کے مزار پر خاموشی اور سکون کے سوا اور کیا ہے۔

ابھی چند دن ہوئے مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی دہلی سے آئے شام کو مغرب کے بعد وہ ان کے دونوں صاحبزادے سعید اور محمدؐ اور میں ابا جی کے مزار پر گئے۔ میرا جی چاہتا تھا کہ ابا جی اپنے گوشۂ مزار سے مولانا حبیب الرحمٰن کے سلام کا جواب دیں، قبر شق ہو جائے اور اندر سے وقار و سنجیدگی کا وہی حسین پیکر باہر آ کر کھڑا ہو جائے، جسے دیکھنے کے لئے دُور دراز سے لوگ آتے تھے، وہی سبز رنگ کا عمامہ، سبز رنگ کا چوغہ، سیاہ سیاہ غلافی آنکھیں اور خوبصورت چہرہ نظر آ جائے، جسے اپنے ہاتھوں سے ان کے ہزاروں شاگردوں نے شام کی تاریکیوں میں یہاں دفن کر دیا تھا، فاتحہ پڑھ چکنے کے بعد میں دیر تک ان کی قبر پر ٹکٹکی باندھے کھڑا رہا میرے تحت الشعور میں یہی خیال قائم تھا کہ ابا جی اب اٹھے اور اب اٹھے مگر ہائے ع سچ ہوا کرتی ہیں ان خوابوں کی تعبیریں کہیں

رات بڑھتی آئی، اندھیرا گہرا ہوتا چلا گیا، قبرستان میں اداسیاں پھیل گئیں، درخت زور زور سے ہلنے لگے، ہواؤں کی سنسناہٹ دل کو توڑے لیتی تھی، تاریکی اور اندھیرا سرکش جنات کی طرح سر چڑھے جاتے تھے، قبرستان کے کسی گوشے سے کسی طالب علم کی تلاوت کی آواز آرہی تھی میں آہستہ آہستہ باہر نکلا تو عید گاہ کی دوسری طرف سے ہرٹ چلنے کی آواز خاموشی اور سکون کے سینے کو چیرتی اور رات کی تاریکیوں سے لڑتی جھگڑتی آگے بڑھ رہی تھی، ہرٹ کی آواز میں کیا کیفیت ہو سکتی ہے؟ نہ خوشی اور مسرت کا نغمہ اور نہ رنج و غم کی دلدوز داستان، مگر میرے دل سے اٹھتے ہوئے رنج و غم کے شعلے، ہرٹ کی آواز میں جذب ہو گئے، مجھے ایسا معلوم ہوا کہ میرے دل کو کسی نے تھام لیا، میرا سانس ٹوٹا جا رہا تھا، اسے کسی نے سنبھال لیا، میری روح نکلی جا رہی تھی، وہ اپنی جگہ تھم گئی۔

شاہ جی کی خدمت میں میرا سلام کہہ دینا، ان کی عظیم الشان شخصیت ان کی طویل قومی خدمات، ان کی زبردست شعلہ بیانی، ان کے حسین وجود ان کی سحر آفریں زندگی، ان کی بے غرضی، بے نفسی اور بے ریائی، ان کے دور افتادہ از سر کا سلام۔ آج ۸ رمضان ہے، دوپہر کے بعد آپ کی فرمائش کی تعمیل میں یہ چند سطریں لکھنے بیٹھ گیا۔ مجھے پتہ نہیں کہ یہ ہذیان سرائی آپ کو پسند آئے گی یا نہیں۔ میرا مقصد صرف آپ کی فرمائش کی تعمیل ہے۔

سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ کی وفات پر

"ایک بجلی، ایک آندھی، اور ایک طوفان"

شاید سیماب کا شعر ہے کہ ؎

خاکِ پروانہ، رگِ گُل، عرقِ شبنم سے
اس نے ترکیب تو سوچی تھی مگر دل نہ بنا

اور واقعہ یہ ہے کہ غیر اللہ کے لئے جاندار اور دھڑکتا ہوا دل بنا لینا بہت ہی مشکل ہے، سائنس کی عجوبہ کاریاں اگر متحرک، زندہ اور جاندار دل بنا لینے میں کامیاب ہو جاتی ہیں تو تخلیق اور آفرینش سے ان کا فاصلہ کچھ دُور نہیں رہتا مگر جب قدرت نے خود ارادہ کیا تو اس نے پہاڑوں کی سنگینی، بجلیوں کے زور طوفانوں کے شور، آندھیوں کی بلاخیزی، بادلوں کی گرج، درختوں کی بلندی صحرا کی وسعت، صبح کی بہار آفرینی، شام کی رعنائی، راتوں کے سکون، پھولوں کی لطافت، کلیوں کی نزاکت، بادِ صبا کی شوخی، آبشاروں کے ترنم اور بہت سی متضاد چیزوں کو جمع کر کے ایک وجود بنایا اور سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ اس کا نام رکھا۔

سید عطاء اللہ شاہ بخاری ۱۹۱۹ء سے لے کر ۱۹۴۷ء تک کشمیر سے لے کر راس کماری تک ہر صوبہ، ہر شہر اور ہر بستی میں چیختا اور چلاتا، روتا رلاتا ہنستا بولتا، گرجتا برستا پھرتا رہا، شاید ہی کوئی شہر ہو جس کی فضاؤں میں بخاری کی تقریروں کی روانی، ایک پوشیدہ قوت بن کر جاگزیں نہ ہو۔

آج جواہر لال، ان کی وزارت عظمیٰ اور ان کی حکومت بخاری سے اس درجہ بے نیاز تھی کہ بخاری کی موت پر جواہر لال کے منھ سے ایک بھی آواز ایک بھی آہ، اور ایک بھی حرف نہ نکلے مگر تاریخ اسے نہیں بھلا سکتی کہ گاندھی اور جواہر لال کی سیاست کی کامیابی میں بڑا دخل بخاری کی تقریروں کو ہے۔ ہندوستان کے مسلمان بخاری کو بھول جائیں مگر یہ واقعہ ہے کہ ہندوستان میں جب کوئی ایک مسلمان کسی پریشانی سے رویا ہے تو عطاء اللہ شاہ کے آنسوؤں نے اس کا ساتھ دیا ہے، جب بھی کسی مظلوم نے اسے آواز دی ہے تو وہ سینہ تان کر اس کی حمایت میں سامنے آ گیا ہے، گجرات، ملتان، دہلی، علی پور (بنگال) لاہور، امرتسر کی جیلیں اس کی یادگار ہیں، آج نہ سہی ایک وقت ضرور آئے گا جب آنیوالی نسلیں ان جیلوں کو بخاری کی قیام گاہ کی حیثیت سے آثارِ قدیمہ میں شامل کر دیں گی۔

آج تاج محل، مغل آرٹ کا ایک نشان اور ہندوستان کی عظمت کا ایک باوقار نمونہ ہے، وقت مجبور کرے گا کہ امرتسر اور ملتان میں سید عطاء اللہ شاہ بخاری کے مکانات کو اپنی تاریخ حریت کی یادگار کے طور پر محفوظ کیا جائے۔

لاہور کے ایک جلسہ میں پیغمبر برحق صلی اللہ علیہ وسلم کی توہین کرنیوالے ایک مصنف کے خلاف احتجاج کیا جا رہا تھا۔ لاکھوں کے مجمع میں بخاری نے کہا کہ وہ دیکھو سامنے! خدیجہؓ الکبریٰ کھڑی شکایت کر رہی ہیں کہ میرے شوہر نامدار کی توہین کی گئی اور لاکھوں مسلمانوں میں سے ایک بھی نہ بولا لو، وہ سنو فاطمہ زہرا فرماتی ہیں کہ میرے باوا جان کی بے عزتی کی گئی اور ان کی امت نے کچھ نہ کیا" تو لاکھوں کے اس مجمع کی چیخیں نکل گئیں اور سینکڑوں مسلمان عورتوں نے اپنے شیر خوار بچوں کو شاہ کے سامنے پھینک دیا۔

کہ ہم اپنے جگر گوشوں کو ناموس رسول ؐ پر قربان کرتے ہیں۔ کوئی اور بھی اگر ایسا جادو بیان خطیب ہو تو مجھے بتاؤ۔

۷۳ سال کی عمر پوری کر کے شاہ نے ۲۱ اگست کی شام کو جان جان آفریں کے سپرد کی، اور ۲۲ کو بعد ظہر تقریر و خطابت کے اس بادشاہ کو منوں مٹی کے نیچے دبا دیا گیا، شاہ کی موت پر ایک تاریخ ختم ہو گئی، ایک عہد گذر گیا، ایک دور پورا ہو گیا، ایک چمن اجڑ گیا، ایک بہار لٹ گئی، تقریر و خطابت کی رونق ختم ہو گئی جرأت و شجاعت کا شیرازہ بکھر گیا اور خلوص و دیانت پر افسردگی چھا گئی، اب نہ کبھی شاہ نظر آئیں گے، نہ ان کی تقریریں سننے کا موقع ملے گا، لیکن جب بادل گرجے گا، بجلی چمکے گی، موسلا دھار بارش ہو گی، طوفان اور سیلاب آئینگے جب کبھی صبح ہو گی اور جب کبھی شام آئے گی، جب کبھی پھول کھلیں گے، اور کلیاں مسکرائیں گی، جب کبھی باد صبا پھولوں اور کلیوں سے چھیڑ چھاڑ کرتی چمن سے گذرے گی، جب کبھی کوئی قرآن پڑھے گا، اور جب کوئی رات کی آخری اور خشک ساعتوں میں لاکھوں اور ہزاروں کے مجمع کے سامنے تقریر کرے گا، جب کوئی مجرم حق گوئی کی پاداش میں قید و بند کی صعوبتوں سے گذرے گا، جب کوئی مرد حق اللہ اور اس کے رسول ؐ کی عزت کے لئے اپنے جسم و جان کا نذرانہ وقت کے کسی ظالم اور قاہر کے سامنے پیش کرے گا مجھے اس وقت سید عطاء اللہ شاہ بخاری ضرور یاد آئیں گے کہ ان سب چیزوں میں مجھے عطاء اللہ شاہ بخاری کی شباہت ملے گی۔ عطاء اللہ شاہ کی کچھ ادھوری سی نقل، سید عطاء اللہ شاہ بخاری کی ۷۳ سالہ مجاہدانہ زندگی، اس کے خلوص و دیانت، اس کی تقریر و شعلہ بیانی، اس کی حسین جوانی، اس کے پر وقار بڑھاپے کو، اس کے لاکھوں عقیدت مندوں کی طرف سے ہزاروں سلام۔ رحمۃ اللہ رحمۃ واسعۃ وغفر لہ اللہ مغفرۃ کاملۃ۔

جگر مرادآبادی کی شاعری

مندرجہ ذیل مضمون ماہنامہ" کتاب لاہور" کے لئے لکھا گیا تھا جو اس کے جون کے پرچہ میں شائع بھی ہو چکا ہے، مگر اڈیٹر صاحب کتاب کی" انقلاب پسندانہ" قلمطرازی نے اس بچے تلے ہوئے مضمون کا پہلا حصہ حذف کر کے اسے مہمل درجہ کی ایک ایسی چیز بنا دیا کہ مضمون کی حیثیت سے اس کی اشاعت خود مضمون نگار اور مضمون کے پڑھنے والوں کے لئے انتہائی تکلیف دہ ہو سکتی ہے۔ کاش اڈیٹر صاحب کتاب کا صوبہ وارانہ جذبۂ عصبیت انھیں مہلت دیتا اور وہ اس غلط جذبہ کے ماتحت حضرت جگر کی ہمہ گیر شاعرانہ عظمت سے یوں حاسدانہ سلوک نہ کرتے۔ صداقت میں اس مضمون کی مکرر اشاعت صدائے احتجاج ہے، ادارہ کتاب کی اس غیر ذمہ دارانہ اور ناشائستہ حرکت کے خلاف۔

غزل کی صنف شاعری میں اس حیثیت سے کہ اس کا ہر شعر اختصار جامعیت، معنی آفرینی، اثر انگیزی، ایک دلاویز خوبصورتی ایک موثر سوز و گداز، ایک حسین قسم کی بناوٹ اور مختلف خیالات کے تنوع کی بنا پر ایک مستقل مکمل اور ہر اعتبار سے مضبوط شئے تسلیم کیا گیا ہے۔ بے شبہ نظم مسلسل پر فوقیت رکھتا ہے۔

نظم کی حیثیت اس سے زیادہ اور کچھ نہیں کہ اس کے بیس پچیس یا دس پندرہ شعروں میں آپ کسی واقعہ، کسی حادثہ، کسی خیال یا کسی منظر کو نظم کر دیں، اور جب تک پوری نظم نہ سنا لیں اس وقت تک کسی سننے والے سے

متاثر و محظوظ ہونے کی ہرگز توقع نہ کریں، نظم کا کوئی شعر کبھی مکمل نہیں ہوتا بلکہ اس کے تمام اشعار میں ایک معنوی تسلسل اور باہمی ربط کا پیدا ہونا ناگزیر ہے اور یہی معنوی تسلسل اور باہمی ربط اس کے ہر شعر کی جداگانہ اور مستقل حیثیت کے حق میں مضر ہے۔ مختصر یہ کہ اپنی بات کسی آدمی تک پہنچانے اور اسے اس بات سے متاثر کرنے کے لئے آپ ایک لمبی چوڑی نظم سے جو کام لے سکتے ہیں یہی کام غزل کے ایک شعر سے بھی لیا جا سکتا ہے۔

غزل کے ہر شعر کے لئے مکمل و مستقل ہونے کی یہ جہاں اتنی بہت سی قیدیں ہیں وہاں ایک دقت اور بھی ہے، غزل کے چند گنے چنے مضامین ہیں، چند بنیادی خیالات اور بار بار استعمال میں آئے ہوئے چند اذکر و نظر کے اعتبار سے حسن و عشق کا اور ان دونوں کے معاملات، کیفیات اور جذبات کا صرف ایک مرکز ہے، جس پر شروع سے لے کر آج تک غزل گو شعراء گھوم رہے ہیں، کبھی ہفتوں، مہینوں اور سالوں میں کسی غزل گو شاعر نے اگر خیال و معنی کے اعتبار سے کوئی نیا شعر کہہ لیا تو اس بنا پر کہ وہ غزل کی بنیادی وحدت خیال سے کسی طرح جدا نہیں ہو سکتا اور اس کی پرواز خیال زیادہ سے زیادہ ان بلندیوں تک پہنچ کر رک جاتی ہے جہاں سے غزل کی اساس خیال اور اصل جبات کو متاثر کرنا مشکل ہوتا ہے، حقیقتاً آٹے میں نمک کی حیثیت رکھتا ہے۔ ہمیں ذرا اپنے اس خیال کی اور تفصیل کرنی ہوگی اور وہ یہ کہ اگر آج کسی غزل گو شاعر نے ہجر و فراق کی کیفیت بیان کرتے ہوئے بڑی محنت سے کوئی ایسی بات کہہ دی جو آج تک نہ میرؔ نے کہی نہ غالبؔ نے اور نہ ان سے پہلے اور بعد کے شعراء نے، تو ظاہر ہے کہ یہ جدت تخیل غزل کو بنیادی اعتبار سے بدل دینے میں کامیاب نہیں ہو سکتی "خیال" تو بنیادی طور پر "ہجر و فراق" کا وہی ایک خیال رہا جسے برسوں سے غزل گو شعراء دہراتے اور طرح طرح سے بیان کرتے چلے آئے ہیں۔

ظاہری اور معنوی دقتوں اور تنگیوں کے اس میدان میں بہت کم ایسے شاعر ہیں جو کامیابی کے ساتھ غزل کی شرائط کو نبھا، اس کی تمام خوبصورتیوں کو باقی اور سارے عیوب سے کنارہ کش رہ سکتے ہیں۔

پچھلے شاعروں میں میر۔ درد۔ غالب، ذوق۔ مومن اور مرزا داغ وغیرہ کو آپ کامیاب غزل گو کہہ لیجئے مگر اس فہرست میں اب ناسخ، آتش، جرأت انشا۔ رند، صبا اور اس نوع کے شاعروں کا نام نہیں آسکتا، اس لئے کہ ان سارے شاعروں کی حیثیت آج ادب کے بازار میں غزل کی ابتدائی زندگی میں اس کی پرورش کا فرض منصبی ادا کرنے والے لوگوں سے زیادہ نہیں اور ظاہر ہے کہ ادب اردو کے موجودہ رجحانات کا یہ اتنا سا اعتراف ان شاعروں کے سرمایہ کلام کی حیات و بقا کا ضامن نہیں ہوسکتا، آج کون ہے جو ان شاعروں کے کلام کو فنی مطالعہ اور ادبی اور اپنے شعری علم کو بڑھانے کے خیال کے سوا کبھی دلچسپی کی نظر سے یا ذوق طبع کے تقاضوں سے مجبور ہوکر پڑھتا ہے، وہ کون سی سوسائٹی ہے جہاں ان شاعروں کے بنائے ہوئے انداز و اطوار کی تقلید کیجا رہی ہے، اور ان فرسودہ قسم کا ذوق رکھنے والے لوگوں کی تعداد کتنی بڑی ہے جو آج سے صدیوں پہلے کے ایک مرگ زدہ، کاہل اور بے مغز ماحول کے پیدا کئے ہوئے ان شاعروں سے تعلق رکھتے ہیں؟

حضرت جگر مرادآبادی ان غزل گو شعرا میں سے ایک ہیں جن کی شاعری ایک زندہ حقیقت کہلائی جاسکتی ہے، ادب اردو کے اس حصہ غم کو انھوں نے اپنے سامعہ نواز نغموں سے جو حسن شباب عطا کیا ہے وہ ایک کھلی ہوئی حقیقت ہے اور اس موقعہ پر کسی ادنیٰ تفصیل و تشریح کی بھی محتاج نہیں گو بہت سے لوگوں نے جگر کو شاعر نہیں بلکہ مغنی اور ان کے مجموعۂ کلام "شعلہ طور" کو بہت حد تک غیر معیاری مانا ہے، اور اس حقیقت کا اعتراف ہر سخن سنج اور منصف مزاج انسان کے لئے ضروری ہے کہ جگر کی شاعری کو

اپنی زندگی کے جن اوقات میں ایک ماہر استاد کی اصلاح ورہنمائی کی ضرورت تھی جگر اس سے محروم رہے ہیں، پھر جگر چونکہ اپنی شخصی زندگی میں سخت قسم کے بے پروا اور لاابالی انسان ہیں انھیں اپنی شاعری کی بہتی ہوئی ندی کو غلطیوں کے خس و خاشاک سے پاک رکھنے کی جو کوشش کرنی چاہیئے تھی وہ بھی اسی لاابالی پن کی وجہ سے نہیں کی جاسکی ہے لیکن ان تمام باتوں کے باوجود یہ کبھی تسلیم نہیں کیا جاسکتا کہ جگر صرف مغنی ہیں یا "شعلۂ طور" قطعاً غیر معیاری کتاب ہے اگر اپنا کلام ترنم کے ساتھ پڑھنے کے جرم میں جگر صاحب مغنی بتائے گئے ہیں تو پھر حفیظ جالندھری، ساغر نظامی، احسان دانش اور اس قسم کے بیسیوں شاعر صرف مغنی ہیں شاعر نہیں۔

آج پرانے طرز پر مری گلی ہوئی آواز اور دبے بھنچے ہوئے انداز میں نواب سائل دہلوی کے سے دو چار شاعر ہوں تو ہوں مگر نواب سائل کی بعد کی شاعری میں یہ ترنم، یہ خوش گلوئی، یہ نغمہ اور یہ لحن صورت بجا طور پر اجزائے ترکیبی کی حیثیت سے شریک کیئے جاچکے ہیں۔ رہا شعلۂ طور کے متعلق یہ اعتراض کہ وہ رطب و یابس سے لبریز ہے اور اس میں نہایت سستی قسم کی غزلیں بھی شامل کرلی گئی ہیں، میرے نزدیک قطعاً مہمل ہے، آپ ہر شاعر کو آخر کار قدرت کا شریک کار کیوں گردانتے ہیں کہ وہ جب کوئی بات کہے تو مافوق العادۃ قدرت و قوت کے زور سے ہی کہے، یہ شاعری آخر خدائی تو ہے ہی نہیں کہ اس کا ذرہ بھر اپنے معیار سے ادھر ادھر ہونا خدا کی جلالت شان اور عظمت کبریائی کا ادھر سے ادھر ہونا سمجھا جاتا ہے۔ جس طرح انسان دنیا کے اور سارے کاموں میں کبھی نیکیاں کرنے اور کبھی غلطیاں کھاتے اور جس طرح دوسرے اہل علم علوم و فنون کے دوسرے میدانوں میں کبھی کوئی اچھی بات پیدا کرتے اور کبھی یوں ہی بے جوڑ باتیں کرنے کے عادی ہیں۔ ٹھیک اسی طرح شاعری بھی قدرت کی عطا کی ہوئی ایک نعمت ہے، انسانوں ہی کی ایک ذہنی کاوش ہے اور ہمارا ہی

بنایا، پھیلایا اور بڑھایا ہوا ایک فن، پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ شاعری کے میدان میں ہم کبھی غلطیاں نہ کریں، اور کیا کسی زبان کے کسی ایک ادیب، کسی ایک شاعر کے متعلق ذمہ داری کے ساتھ یہ دعویٰ کیا جا سکتا ہے کہ وہ اپنی ذہنی کاوشوں اور ادبی ذخائر کو بلندی کے ایک معیار پر قائم رکھ سکا ہے؟ مجھے تسلیم ہے کہ شعلہ طور میں بعض غزلیں بہت بے مزہ اور بے جان ہیں مگر ان کی حیثیت کثیر التعداد اور بلند پایہ غزلوں کے مقابلہ میں قابل ذکر ہے ہی نہیں اور ان چند غزلوں سے جگر کی شاعرانہ عظمت کو کوئی دھکا نہیں لگتا ہے۔ جگر کی غزل اردو کے رخ روشن پر ایک خوبصورت جھومر کی حیثیت سے آویزاں ہے اور ہمیں ماننا پڑے گا کہ یہی جگر، اصغر، حسرت، اور فانی سے چند غزل گو شاعر تھے جنھوں نے اردو غزل کو ذلیل و رکیک مضامین سے آزاد کرا کر ہمارے احساسات وجذبات کے قریب لا کھڑا کیا ہے۔

پہلے غزل کی پرانی اصطلاحات کے گنبد بے در میں ہر شاعر کی شخصی زندگی اور ذاتی جذبات دھواں بن کر اڑ جاتے تھے، حالات کی ترجمان ہے اور اپنی واردات زندگی کی شارح، اور بتایئے کہ عصر حاضر کے شعراء کی یہی کامیابی کیا کم ہے۔؟

جگر کی شاعری کا تازہ دور جس میں وہ عشق و محبت کی رسمی کہانیوں سے گریز کر کے حقیقت کے ایک پر وقار، پرمعنے اور پائیدار ڈھب کی طرف تیزی سے بڑھے آرہے ہیں، گو پہلے کی طرح عوام و خواص میں مقبول نہ ہی لیکن جدت خیال شدت احساس، علوئے فکر، زور طبع، عالمانہ باریک بینی اور سنجیدہ گوئی کے لحاظ سے بہت خوش آیند ہے اور ہمیں امید کرنی چاہیئے کہ اب کچھ ہی دنوں میں جگر کا ایک نہایت سنجیدہ مجموعہ کلام بھی ہمارے ہاتھوں میں ہوگا۔

جگر مُرادآبادی

(موت کے بعد)

جان کر منجملۂ خاصانِ میخانہ مجھے
مدتوں رویا کریں گے جام و پیمانہ مجھے
ننگِ میخانہ تھا میں ساقی نے یہ کیا کر دیا
پینے والے کہہ اٹھے یا پیرِ میخانہ مجھے

ابھی کچھ دنوں کی بات ہے جگر صاحب نے اپنے زمانۂ علالت میں ایک غزل کہی، اس کا مقطع تھا ؎

مرگِ جگر پہ کیوں تری آنکھیں ہوں اشک ریز
اک سانحہ تو ہے مگر اتنا اہم نہیں

یہ مقطع نظر سے گذرا تو میں نے بے اختیار کہا کہ جگر کی موت ایسی نہیں ہو گی کہ ادبی حلقے اس سانحہ پر اشک ریز نہ ہوں اور آنکھوں کے رونے کا کیا سوال ہے، ادب اردو کے اس دور کے لئے یہ اتنا بڑا حادثہ ہو گا کہ ادب شناس حلقوں کی آنکھیں نہیں بلکہ دل روئیں گے اور مدتوں تک روتے رہیں گے۔

اور ہونی بات اپنے وقت پر پوری ہو کر ہی رہی، سچ یہ ہے کہ حق تعالیٰ کی قدرت سب سے بڑی اور اپنے ارادے میں کسی کی محتاج نہیں، اس کی طاقت و عظمت کے سامنے بڑے بڑے سپہ سالار، بڑے بڑے حکمراں

ادیب، شاعر، مقرر، سائنسداں، صناع، فنکار، چھوٹے بڑے سب عاجز ہیں، کسی زندگی کے لئے آپ کتنی ہی یہ تمنا کریں کہ ابھی یہ اور باقی رہے، اپنے کسی بڑے اور بزرگ کے لئے آپ کی کیسی ہی خواہش ہو کہ اس کا چراغ زندگی ابھی نہ بجھ پائے مگر ان تمناؤں اور خواہشوں سے ہوتا کیا ہے، موت کا فرشتہ آکر ٹلتا نہیں اور پیغام اجل انسانی زندگی کے تانے بانے کو توڑے اور بکھیرے بغیر کبھی آگے قدم نہیں اٹھا سکتا۔

اذا جاء اجلھم لا یستاخرون ساعۃ ولا یستقدمون

آج حسرت و افسوس ہے کہ اس دور کا سب سے بڑا غزل گو شاعر ہمارے درمیان سے اٹھ گیا، حسن و عشق کا رازداں رخصت ہوا، ایک شریف انسان چل بسا، وہ نکتہ دانِ ادب ہم سے رخصت ہوا جس کی غزل نے غزل کے فن اور اس کے حسن و نزاکت کو زندہ رکھا تھا، وہ شخص چلا گیا جس کی سادی زندگی ایک غزل تھی، خود اس کی غزل کی طرح حسین، شیشے کی طرح نازک، قلقل مینا کی طرح سامعہ نواز، صحن میکدہ کی طرح پر شور، شراب آتشیں کی طرح نشہ آور اور دورِ جام کی طرح ہر وقت رواں دواں۔

مجھے جگر صاحب سے عقیدت نہیں تھی، جگر صاحب عقیدت کے قابل کوئی چیز کبھی نہیں تھے یا یوں سمجھئے کہ میری زندگی اور میرے ذہن میں عقیدت کا کوئی خانہ ہی نہیں مگر ہاں جگر صاحب سے ایک تعلق تھا، ان کے مزاج کی آشفتہ سری اور ناہمواری کے باوجود ان سے محبت تھی، ان کے وحشتناک چہرہ اور بے ڈھنگے بالوں کے باوجود ان سے لگاؤ تھا اور کچھ ایسی محبت تھی، جیسے محبت کرنے والوں کو اپنے کسی حسین اور خوش وضع خوبصورت محبوب سے ہوتی ہے، ان کی غزل نظر پڑتی تو اسے دامنِ دل میں چھپاتا، کبھی ریڈیو پر ان کی آواز سنائی دیتی تو لپک کر اور دوڑ کر سنتا، وہ خود کہیں ملتے تو ان کے پاس سے جانے اور اٹھنے کو دل نہیں چاہتا، ان کا خط آتا تو

ہفتوں اسے بار بار پڑھتا رہتا۔
جگر کی غزل میرے لئے ایک جام شراب تھا کہ کوئی تازہ غزل ہاتھ آئی، اور ہفتوں اسے گنگناتا رہا اور اس پر سر دھنتا رہا، اور میں پوری بے تکلفی کے ساتھ اس کا اقرار کرتا ہوں کہ نہایت کریہہ الصوت اور ترنم سے ناآشنا ہونے کے باوجود ابتدائے عمر میں سالہا سال تک جگر صاحب کے لہجہ میں اپنی تنہائیوں میں جگر صاحب کی غزلیں گاتا رہا ہوں، آج آپ اگر مجھ سے دریافت کریں کہ بھوپال کے مشاعرہ میں جگر صاحب نے کونسی غزل کس لہجہ میں پڑھی تھی، دہلی کے فلاں مشاعرے میں ان کا آہنگ کیا تھا، لاہور سے ان کی غزل کیسے ہوئی تھی، شملہ میں وہ کیسے نغمہ سرا تھے تو مجھے اپنے حافظہ سے امید ہے کہ میں اس کی پوری تفصیل بیان کردوں گا، اور اچھی خاصی نقل بھی اُتار لوں گا۔
۲۷ سال کا عرصہ کچھ تھوڑا نہیں ہوتا، اس عرصہ میں خبر نہیں کتنے انقلاب دیکھے، ذہن و فکر کن کن مرحلوں سے گذرے اور شعور و عقل نے تجربات کے کیسے کیسے میدان طے کیے، کل جن کی شخصیت کا خاص اثر اپنے قلب میں تھا آج وہ فراموش ہوگئے، جن کی تحریر و تقریر سے کبھی دلچسپی تھی آج وہ ذہن سے اتر گئے، جن کے علم و فضل کا قلب لوہا مانتا تھا وہ آنکھوں سے گر گئے، جن کے قلم کی جولانیوں پر دل فریفتہ تھا ان کی یاد دل سے نکل گئی مگر ۲۷ سال کے اس عرصہ میں اس طویل عرصہ کے لق و دق میدان کے ہر مرحلہ پر، ہر ہر منزل اور ہر ہر قدم پر مجھے جگر صاحب یاد رہے اور جگر صاحب کی غزل یاد رہی۔ ۲۷ سال پہلے جس گہرائی کے ساتھ قلب نے ان کی محبت کو قبول کیا تھا آج ۲۷ سال کے بعد وہ محبت اسی طرح موجود ہے، ان کی شخصیت میں میرے لئے وہی مقناطیسی اثر ہے اور ان کی غزل آج بھی کسی ساحرۂ رعنا کا رُخ تابناک ہے جسے دیکھنے سے میرا دل نہیں بھرتا، کسی

محبوب طناز کی زلف برہم ہے جسے سلجھاتے جی نہیں اکتاتا۔

میں حالات وواقعات کے کچھ ایسے دور میں آگیا ہوں کہ کم از کم شعر و شاعری کا دفتر تو مجھے بھول ہی گیا، پہلے فارسی اور اردو شعرار کے تمام دواوین میرا بہترین سرمایہ تھے، آج کوئی بھی دیوان میرے پاس نہیں اور کسی دیوان، شعروشاعری کی کسی کتاب کو اٹھا رکھنے کا اہتمام نہیں مگر "شعلۂ طور" آج بھی میرا رفیق ہے، میری الماری میں چاہے کچھ نہ ہو مگر شعلۂ طور ضرور ملے گا۔

جگر صاحب کی موت، اردو ادب کے لئے کتنا بڑا سانحہ ہے؟ جگر صاحب کی موت سے ادبی حلقوں کو کتنا بڑا صدمہ پہنچے گا؟ جگر کی موت سے غزل کی دولہن کیونکر بے رنگ وروپ ہوجائے گی؟ جگر کی موت سے محفل ادب پر کیا گذرے گی؟ جگر کی موت سے اس کے پرستار کیا اثر لیں گے، جگر نے مر کر شرافت انسانیت اور وضع داری کو کس کے سہارے چھوڑا؟ یہ سب باتیں نہ میں سوچ سکتا ہوں نہ یہ چیزیں میرے سوچنے کی ہیں۔ میں تو آج اپنے دل سے پوچھتا ہوں کہ جسے محبت کا بڑا دعویٰ تھا اور جو زندگی کی ہماہمی کے لئے محبت کی کسک اور چبھن کو آج تک ضروری سمجھتا رہا ہو ؂

وہ سادہ دل ہوں کہ تجھیں زندگی کیلئے
سمجھ رہا ہوں محبت کو لازمی اب تک

حضور! لے دیکھئے یہی صرف ایک شخص تھا جس سے محبت تھی، بے داغ اور بے میل محبت، آج اس کے رخصت ہوجانے کے بعد اب کس سے محبت کروگے؟ کیسے چاہوگے اور کس کے چاہنے میں مزہ پاؤگے؟ اردو کا وہ نازک بیان شاعر آج جو منوں مٹی کے نیچے پڑا ہے، ترنم نغمہ، اور شہر غزل پر آج موت چھا گئی ہے۔ کس کے ترنم پر سر دھنوگے

کس کے نغمہ پر جان چھڑکو گے، اور کس کی غزل سر آنکھوں پر رکھو گے ؟

جگر کی موت میرے لئے کوئی اس قسم کا حادثہ نہیں کہ میں نے اپنی کوئی قیمتی چیز کھودی ہے بلکہ کچھ ایسا سانحہ ہے کہ جیسے میں خود گم ہو گیا ہوں جیسے میں نے اپنے آپ کو کھو دیا ہو، جیسے میں چلتے چلتے راستہ بھول گیا ہوں جیسے میرے ہوش و حواس جاتے رہے ہوں، جیسے مجھ سے نطق و گویائی کی طاقت سلب کر لی گئی ہو، اور آپ خیال فرما سکتے ہیں کہ ان جذبات و تاثرات کے عالم میں میں کیا جگر صاحب کی شخصیت پر روشنی ڈال سکتا ہوں۔ دلدوز آہوں، دبی دبی سسکیوں، ٹوٹے ہوئے دل، جلے ہوئے جگر، اشک فشاں آنکھوں اور بے ربط جملوں میں خالق کائنات کی بارگاہ عظیم میں جگر کی مغفرت اور عالم آخرت میں ان کی کامیابی، اور مقبولیت کی دعا کرتا ہوں، یہ مرد قلندر آج اپنے لاکھوں پرستاروں دوستوں اور چاہنے والوں کی محفل سے اٹھ کر تیری بارگاہ میں حاضر ہے خود جگر صاحب کا شعر ہے ؎

دل کو سکون، روح کو آرام آگیا
موت آگئی کہ یار کا پیغام آگیا

تیرے نبیؐ کا وہ ارشاد کہ جس کے جنازہ پر چالیس آدمی بھی اس کے دیندار اور بہتر مسلمان ہونے کی شہادت دیں گے تو حق تعالیٰ کی رحمت کہنے والوں کی لاج رکھے گی اور مرنے والے پر رحمت و مغفرت کے دروازے کھولدئے جائیں گے، خود تیرا یہ ارشاد کہ ادعونی استجب لکم، مجھ سے مانگو میں دینے والا ہوں، سچ ہیں اور یقیناً سچ ہیں۔

بار الہا! جگر تنہا نہیں بلکہ اپنے لاکھوں جانثاروں کی پرسوز

دعاؤں کے ساتھ تیرے دربار میں حاضر ہے، اس کے نامۂ اعمال میں وہ لغت دیکھئے جس سے تیرے محبوب کے عاشقوں نے یہاں راحت پائی ہے ۔

اک رند ہے اور مدحتِ سلطانِ مدینہ
ہاں کوئی نظر رحمتِ سلطانِ مدینہ
اے خاکِ مدینہ تیری گلیوں کے تصدق
تو خلد ہے تو جنتِ سلطانِ مدینہ
ظاہر میں غریب الغربا، پھر بھی یہ عالم!
شاہوں سے سوا سطوت سلطان مدینہ
کونین کا غم، یادِ خدا، دردِ شفاعت
دولت ہے یہی دولتِ سلطانِ مدینہ
جگرؔ ہم کو نہیں کام بس اور کسی سے
کافی ہے بس اک نسبتِ سلطانِ مدینہ

اور اس کا وہ شعر سنئے جس میں اس نے آپ کی توحید کا اظہار و اعلان کیا تھا کہ ؎

مجازی ہے جگرؔ کہہ دو ارے او عقل کے دشمن
مُقِر ہو یا کوئی مُنکر خدا یوں بھی ہے اور یوں بھی

اور اپنی مے نوشی پر اس نے آپ کی بارگاہِ جلال و جبروت میں ندامت و شرمندگی کا جو نذرانہ پیش کیا تھا وہ بھی خیال میں رہے ؎

اے رحمتِ تمام میری ہر خطا معاف
میں انتہائے شوق میں گھبرا کے پی گیا

ابھی چند برس ہوئے رسول عربی صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ جلالت پناہ میں

حاضر ہو کر اس نے کس درد و تڑپ کے ساتھ کہا تھا کہ

اے اسم تو حرزِ جانِ عشاق
اے ذکرِ تو نورِ قلب و دیدہ!
اے بر تو نثار شرمِ عصیاں
اے بر تو فدا دلِ تپیدہ
یک گوشۂ چشم التفاتے
بہرا متیانِ غم رسیدہ
رحمت باشارۂ تو رقصاں
جنت بنگاہ ہست آرمیدہ
استادہ بہ پیش بارگاہت
پیرے بہ رُخ آستیں کشیدہ
شاید کہ جگرؔ حزیں ہمیں است
از بارِ گناہ کمر خمیدہ

خداوندا! تو نکتہ نواز ہے، اپنے بندوں پر رحیم و کریم ہے، تیری رحمت ہی تیرے گنہگار بندوں کے لئے پناہ گاہ ہے، جگرؔ کی روح کو اس عالمِ ابدی میں راحت و سکینت عنایت فرما اور ہم سب کو صبر کی دولت سے مالا مال کر۔

احسان دانش

اُردو کے موجودہ نوجوان شعراء میں جو حضرات شعر و سخن کی بہشتِ جانفزا میں بہت جلد آئے اور پھر اپنی ذہانت، فطانت، ذکاوت، جودتِ طبع، صحیح وجدان، قوی احساس، حسن بیان، شدید قوت فکر اور دن رات کے ادبی شغف کی بنا پر بہت تھوڑے عرصہ میں بلبلِ ہزار داستان بن کر اذہان عامہ پر چھا گئے اُن بلند مرتبہ لوگوں میں احسان دانش کا نام آنا ناگزیر ہے، ابھی کچھ ہی دنوں کی بات ہے کہ اخبارات ورسائل میں عام طور پر احسان کا کلام ہماری نظر سے گذرتا تھا مگر ہم اس میں کوئی خاص کشش اور دلچسپی نہیں محسوس کرتے تھے، اس وقت احسان کی شاعری اور شخصیت اردو کے ان سیکڑوں اور ہزاروں شاعروں سے جن کا کلام بالالتزام سیکڑوں پرچوں اور ماہناموں میں چھپتا اور پڑھنے والوں پر کوئی اثر چھوڑے بغیر گمنامی اور گمشدگی کے طاق نسیاں کی زینت بڑھاتا رہتا ہے، کچھ برائے نام ہی اونچی ہو تو ہو مگر یہ واقعہ ہے کہ احسان کو اور اس کی شاعری کو غیر معمولی مقبولیت اس وقت حاصل ہوئی جب قدرتی طور پر احسان نے اپنی نظموں اور غزلوں میں بڑی خوبصورتی اور کامیابی کے ساتھ اپنے اور ہمارے جذبات کی ترجمانی اور اس ترجمانی میں ایک خاص قسم کا بانکپن، ایک خاص قسم کی تراش خراش اور ایک خاص قسم کا بناؤ پیدا کیا۔

احسان کی شاعری کی بنیاد اپنی غمگین زندگی کے نہایت صبر آزما واقعات

بہت گہرے تجربات اور صحیح مشاہدات پر قائم ہے، وہ اپنی عمر رواں کا ایک حصہ مزدوری، باغبانی، پہرہ داری اور پاسبانی کے نہایت تلخ مشاغل کی نذر کر چکا ہے، کچھ اسی زندگی کے تجربات اور اسی زندگی کے تاثرات ہیں جن کے ارد گرد احسان دانش اپنی شاعری کا تانا بانا بنتا اور اسی ایک خیال کی بنیاد پر الفاظ کے اینٹ گارے سے اثر و تاثیر کی ایک عمارت تیار کرتا ہے۔

احسان چونکہ اپنی زندگی میں نہایت صداقت پسند، راست باز، پر خلوص خود دار، فہیم و ذکی اور درد مند انسان ہے اس لئے لازمی طور پر اس کی شاعری میں اثر و صداقت کی روح ایک شعلۂ بیتاب کی طرح لرزتی، تڑپتی نظر آتی ہے اور اس حیثیت سے ہم اردو زبان کے مشہور رہبی خواہ سر تیج بہادر سپرو کے ان الفاظ میں جو انھوں نے ایک موقع پر مرحوم حضرت اصغر گونڈوی کے متعلق کہے تھے کہ "اصغر کے گفتار و کردار میں حیرت انگیز مطابقت ہے" اگر احسان کو خراج تحسین ادا کریں تو ظاہر ہے کہ عدل وانصاف کی کوئی توہین نہیں ہوگی، احسان کو یوں تو شاعری کی ساری اصناف وانواع پر بقدر ضرورت، قدرت حاصل ہے لیکن اس کا اصل موضوع سخن مزدوروں کے بد نصیب اور بدحال طبقہ کی عسرت و غربت اور دلدوز بیچارگی کا خاکہ کھینچنا ہے اور چونکہ احسان فطرۃً ایک کامیاب حلیہ نگار ہے اور وہ ہر سمت اور ہر ماحول اور ہر عالم کی جزوی تفصیلات کو ایک دلچسپ انداز میں بیان کرنے پر قادر ہے یہی وجہ ہے کہ اس کی جو نظمیں مزدوروں اور اسی قسم کے دوسرے غریب طبقوں سے تعلق رکھتی ہیں وہ ان کے حالات اور حالات کے ہر ایک جز کا نہایت مکمل نقش ہیں اور مجموعی طور پر بہت موثر، بیدار کن اور نتیجہ خیز ہیں۔ اس موضوع پر اس کی نظموں کی تعداد بہت زیادہ ہے، مزدوروں اور غریبوں کی زندگی کا کوئی رُخ ایسا نہیں جسے احسان نے اپنے شاعرانہ کمالات سے اجاگر نہ کر دیا ہو، اس کے

جن دیوانوں میں اس قسم کی نظمیں درج ہیں بے شبہ ان دیوانوں کو اس دنیا میں اپنی غربت و ناداری کے باعث مرگ آفریں تکلیفیں جھیلنے والے غریبوں اور مفلسوں کی مکمل داستانِ حیات کہا جا سکتا ہے، پھر ان نظموں کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ نہ تو موضوعِ سخن کی یکسانیت کے باعث احسان کے ذخیرۂ الفاظ کی قلت کا ناگوار احساس ہوتا اور نہ احسان اس داستان کی تفصیل کے لئے ایک ہی قسم کی ترکیبیں، ایک ہی طرح کے الفاظ، ایک ہی سانچے میں ڈھلی ہوئی تشبیہیں استعمال کرتا ہے، احسان کے سوا اردو شاعری کا سب سے بڑا حلیہ نگار جوش ہے اور ان کی بیشتر نظمیں برجستگی، بے ساختگی تنوعِ مضامین، ندرتِ الفاظ، قدرتِ کلام، نئی تشبیہوں، نئے استعاروں کے ایک چڑھتے ہوئے سیلاب کی سی قوت رکھتی ہیں مگر ساتھ ہی اس حقیقت کا اعتراف بھی از بسکہ لازمی ہے کہ ان کا کلام نزاکت و لطافت سے محروم ہے، بہت حد تک بوجھل اور ان اوقات میں جب کسی انسان کا تھکا ہوا دماغ ہلکی سی تفریح کا خواہشمند ہوتا ہے اپنی ثقالت و گرانی کے باعث گوارا نہیں ہو سکتا، اس کے برخلاف احسان کی نظموں میں اثر صداقت اور زور واقعیت کے ساتھ ہی ڈھلے ہوئے ایک افسانہ کی سی نزاکت، لوچ اور شیرینی پائی جاتی ہے، ایک طرح کی اس کی کئی نظمیں ایک مجلس اور ایک صحبت میں پڑھ جایئے مگر نہ تکرارِ الفاظ کے باعث آپ کا جی اکتائے گا اور نہ قلتِ تخیل کی بنا پر اس کی نظموں سے آپ کی طبیعت ابا کر سکے گی۔

احسان نے دولت نوازی اور سرمایہ داری پر مصلحانہ تنقید بھی کی ہے اور بہت حد تک اسے غرور شکن طعنے بھی دیئے ہیں اور پھر انہی طنز و تنقید میں گھلی ملی ہوئی چند کار آمد نصیحتیں، چند دانشمندانہ پیغام اور چند تجربہ کارانہ خطابات بھی ہیں مگر احسان نہ اس خشک طریقہ پر کبھی کسی کو نصیحت کرتا ہے کہ اسے محض ایک ناصح نادان سمجھ لیا جاوے اور نہ ایسے تلخ انداز میں خطاب

کرتا کہ اسے ایک خشک مزاج اور جوشیلا خطیب گردانا جائے، اس کی یہ ساری نصیحتیں، سارے پیغام اور سارے خطابات اس کی شاعری میں یوں گھل مل کر ایک جان ہو گئے ہیں کہ انھیں خود محسوس کیا جا سکتا ہے مگر دوسروں کو بتایا نہیں جا سکتا اور اس کی بہترین مثال کسی خوش ذائقہ پھل سے دی جا سکتی ہے کہ ہمارے کام و دہن اس کی شیرینی اور خوش ذائقگی سے لذت یاب تو ہو سکتے ہیں مگر تفصیلی طور پر دوسروں کے سامنے اسے بیان نہیں کر سکتے۔

احسان کی شاعری نہ جوش کی شاعری کی طرح ثقیل ہے نہ سیماب کی طرح بہت حد تک بے روح، اور کثرت مشق کی آئینہ دار ہے، نہ ظفر علی خاں کی طرح بے رنگ و بو ہے، پٹھانوں کی طرح سخت اور نہ علمائے کرام کے مواعظ کی طرح خشک اور نہ ساغر کی شاعری کی طرح خامکارانہ اور ابتدائے عمر کے گلی کوچوں میں آوارہ و ناکارہ، بلکہ ان سب سے جدا اس کا اپنا ایک مخصوص رنگ ہے جس میں ادب، نغمہ، حقیقت، اثر، صداقت، فکر و علم کی پختگی اور استادانہ مہارت کی شانِ امتیازی بدرجۂ اتم موجود ہے۔

احسان نے اب کچھ دنوں سے غزل کی طرف بھی توجہ کی ہے اور اس میدان میں بھی اس کا راہوارِ فکر ایک خاص شان کے ساتھ دوڑا چلا جا رہا ہے، گو احسان کی غزل ابھی تکمیل و تہذیب کے آخری معیار تک نہیں پہنچی اور غزل کے اس ماحول میں جہاں برس ہا برس سے جگر، اصغر، فانی، حسرت، سیماب، فراق وغیرہ کے نغمے گونجے ہوئے ہیں نئی قسم کی ان زمزمہ پردازیوں کے لئے ذرا دیر میں جگہ نکلے گی، ہمارے ذہن و دماغ پر ان باکمال شعراء کی غزلوں کا جو اثر چڑھا ہوا ہے اسے یکدم مٹا ڈالنا آسان کام نہیں مگر ان تمام موانعات کے باوجود یہ توقع کرنا بالکل صحیح ہے کہ مستقبل میں احسان کی غزل کا پایہ بھی بہت بلند ہوگا، چونکہ احسان کا رجحان طبع آج تک طویل اور مسلسل نظموں کی طرف مائل رہا ہے اور نظم کے

مقابلہ میں اُغزل کی مشق بہت کم نہیں تو کچھ کم ضرور ہے، یہی وجہ ہے
کہ عام طور پر ہم اس کی غزلوں میں بھی نظم کی خوبو پاتے ہیں، مثلاً
اس کی ایک غزل

مطلوب و طالب اکثر رہتے ہیں سر گراں سے
ایک حسن خود نگر سے اک عشق بدگماں سے

کا ایک شعر

سوئے ادب ہے لیکن اے دو جہاں کے والی
کیا خافہ کرنے والے باہر ہیں دو جہاں سے

اپنے مضمون اور تخیل کے اعتبار سے غزل سے بہت دور عصر حاضر
کے عام ادبی رجحانات اور عام انسانی جذبات و تحریکات امارت و غربت
سے قریب ہے۔

احسان کی ساری غزلوں میں اس قسم کا دوسرا کوئی شعر نکل سکے یا
نہ نکل سکے لیکن یہ واقعہ ہے اس کی غزلوں میں بھی ایک خاص قسم کی
نظمیت پائی جاتی ہے، اور ارباب نظر اس حقیقت کو تسلیم کریں گے
کہ ہمارے شعروادب کے بڑھتے اور پھیلتے ہوئے اس زمانہ میں ٹھیٹ
قسم کی پرانی غزلوں میں بہت کچھ اضافہ ہوچکا ہے اور ابھی بہت کچھ
ہونا باقی ہے، غزل کی ظاہری اور معنوی صورت کو ٹوٹ پھوٹ کر کچھ
اور بننا ہے اور اس بننے کو ہم روک نہیں سکتے ہیں۔

آج سے کچھ عرصہ پہلے جب ہمارے ذہنوں اور دماغوں پر سراسر
عشق و محبت کی رنگینیاں اثر انداز تھیں اور ہم تعمیر حیات کے ان شور انگیز
ہنگاموں سے یکسو ایک طرح کی کاہل اور بے مصرف زندگی گذار رہے تھے
تو ہماری غزل بھی صرف عشق و محبت کے انھیں مضامین پر مشتمل
تھی، اب پہلے کے مقابلہ میں ہمارے تجربے، ضرورتیں، خواہشات

ارادے، بہت کثیر بھی ہیں اور بہت بلند بھی، پھر کیوں نہ غزل میں اس قسم کے مضامین داخل کئے جائیں۔؟

ہمیں یقین ہے کہ ہماری موجودہ ادبی ضرورتوں کے مطابق احسان نے غزل کا ساز چھیڑا ہے، اس کا ہر نغمہ سننے والوں کے لئے فردوس گوش ثابت ہو گا۔ اور وہ دن دور نہیں کہ اس قسم کی کامیاب غزل ہمارے لئے سرمایۂ فخر و مباہات بن سکے گی۔!

مولانا ظفر علی خاں

ہمارے ایک سوچنے سمجھنے والے بزرگ اکثر کہا کرتے ہیں کہ ہندوستان میں انگریزوں کی آمد سے ان کی روانگی تک کا وقت ہماری تاریخ کا ایک عبوری دور ہے، عجیب اتفاق ہے کہ اس عبوری دور میں ہمارے ملک میں مذہب، سیاست علم، ادب، شعر اور ثقافت کی ایسی نامور ہستیاں سامنے آئیں کہ پچھلی کئی صدیوں میں ان کی مثال نہیں ملتی۔ بابر اور ہمایوں، اکبر اور شاہجہاں، بیرم خاں اور عبدالرحیم خانخاناں اپنے اپنے وقت میں علم و فضل کے بڑے قدر دان تھے، جنھوں نے ارباب علم و فن کو سونے اور موتیوں میں تول دیا اور ان کی قدر دانی نے ایران و توران، کوفہ و بغداد اور بلخ و بخارا تک کی باکمال شخصیتوں کو ہندوستان کے آستانۂ عظمت پر جمع کر دیا تھا۔

آخری عبوری دور میں ہمارے بڑے لوگوں کی قدر دان نہ انگریزی حکومت تھی اور نہ عوام وقتی واہ واہ کے سوا اور کوئی خراج تحسین ان حضرات کو نہ پیش کر سکتے تھے لیکن اس کے باوجود شعر و ادب میں رابندر ناتھ ٹیگور، سر محمد اقبال، برج نرائن چکبست، علامہ کیفی دہلوی، سیماب اکبر آبادی، اصغر گونڈوی، جگر مراد آبادی، تلوک چند محروم، مولانا حسرت موہانی۔ مولانا ظفر علی خاں، حفیظ جالندھری، اختر شیرانی، تاجور نجیب آبادی پنڈت میلارام وفا، مہاشہ کرشن، اکبر الہ آبادی۔

سیاست میں مہاتما گاندھی، موتی لال نہرو، جواہر لال نہرو، سی۔ آر۔ داس، پریزیڈنٹ پٹیل، سردار پٹیل، پنڈت مالوی، سروجنی نائڈو

مولانا شوکت علی، مولانا محمد علی، حکیم اجمل خاں، ڈاکٹر انصاری، سردار بھگت سنگھ اور ان کے ساتھی، مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا حسین احمد مدنی مولانا حفظ الرحمن مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی، سید عطاء اللہ شاہ بخاری، چودھری افضل حق مولانا مظہر علی مظہر، مسٹر آصف علی، تصدق احمد خاں شیروانی، ارونا آصف علی جے پرکاش نرائن، سبھاش چندر بوس۔

مزاحیہ نگاروں میں شوکت تھانوی۔ حاجی لق لق، پنڈت ہری چند اختر احمد شاہ بخاری، پطرس، مرزا فرحت اللہ بیگ۔ ملا رموزی، چراغ حسن حسرت علماء میں اور دانشور حضرات میں مولانا شیخ الہند، مولانا اشرف علی تھانوی مولانا انور شاہ کشمیری، مولانا آزاد، مولانا حسین احمد مدنی مولانا شبیر احمد عثمانی مولانا مناظر احسن گیلانی، مولانا شاہ حق احمد عثمانی، ڈاکٹر حمید اللہ، پروفیسر میر ولی الدین، پروفیسر مجیب، ڈاکٹر عابد حسین، مولانا اعزاز علی مولانا عبد الباری فرنگی محلی، مولانا عبد الماجد بدایونی، ڈاکٹر بھگوان داس وغیرہ جیسی سر روزگار ہستیاں سامنے آئیں اور انھوں نے اپنے علم وفضل کی تابانی سے ساری دنیا کو روشن کر دیا۔

عبوری دور کے اس بلند پایہ طبقہ سے مولانا ظفر علی خاں کا تعلق ہے جو اپنے وقت میں صحافت و سیاست کے امام، تحریر و تقریر کے بادشاہ اپنی سیمابی طبیعت کے لحاظ سے ایک نامور شخصیت اور عربی، اردو، فارسی اور انگریزی کے مسلم عالم و فاضل تھے، مولانا ظفر علی خاں کا وطن کرم آباد ضلع گجرات تھا، ان کے والد مولوی سراج الدین صاحب عربی فارسی کے فاضل تھے، جموں کشمیر کے محکمہ ڈاک میں سپرنٹنڈنٹ تھے، مولانا ظفر علی خاں کی تعلیم علی گڑھ کالج میں ہوئی، انگریزی میں پروفیسر آرنلڈ اور عربی و فارسی میں مولانا شبلی نعمانی ان کے خاص استاد تھے، مولانا کا فارسی سے پختہ ذوق مولانا شبلی جیسے یگانۂ روزگار ادیب کا عطیۂ صحبت تھا۔

مولانا نے علی گڈھ میں سرسید کا آخری دور اور نواب محسن الملک وغیرہ کا زمانہ پایا تھا۔ طالب علمی ہی کے زمانہ میں اردو فارسی میں ان کی شعر گوئی کا جوہر سامنے آگیا تھا، علی گڈھ یونیورسٹی کے ہائی اسکول میں مولانا ہیڈ ماسٹر بھی رہے۔

علی گڈھ سے مولوی عزیز مرزا کے ساتھ مولانا حیدرآباد چلے گئے، وہاں دار الترجمہ میں مترجم کی حیثیت سے بھی کام کیا اور نظام حیدرآباد کے بھی اتالیق رہے، حیدرآباد ہی کے زمانۂ قیام میں مولانا نے "دکن ریویو" کے نام سے ایک ادبی و سیاسی رسالہ بھی نکالا، جو ابتدائے وقت ہی سے مولانا حسرت موہانی کے رسالہ "اردوئے معلیٰ"، اور سر عبد القادر کے رسالہ "مخزن" کا ہم پلہ تھا، اس کے فنی، سیاسی اور مذہبی مضامین خوش فکر حلقہ میں مقبول تھے۔

حیدرآباد میں مولانا مولوی عزیز مرزا کے ساتھ انگریزوں اور نظام حیدرآباد کے خلاف ایک خفیہ سازش میں متہم ہوئے، اصل یہ ہے کہ یہ پلان صرف انگریزوں کے خلاف تھا، مگر انگریز ریذیڈنٹ نے نظام حیدرآباد سے مولانا کو سزا دلوانے کے لئے اس پلان میں نظام کا نام بھی جوڑا، مولانا کی ملازمت ختم ہوئی اور وہ حیدرآباد سے خارج کر دیئے گئے، مولانا عرصہ دراز تک حیدرآباد نہ جا سکے مگر بایں ہمہ نظام سے ان کا تعلق اور ان کے لئے نظام کی خفیہ مالی امداد جاری رہی۔ متعدد مواقع پر نظام نے مولانا کی گراں قدر امدادیں کیں۔

حیدرآباد سے اخراج کے دس سال بعد دہلی کے ریلوے اسٹیشن پر ایک دفعہ اچانک مولانا کو نظام سے ملنے کا موقع ملا، مولانا فوری طور پر اچھے سے اچھا شعر کہنے پر قادر تھے، کھڑے کھڑے ایک مرصع نظم موزوں فرمائی اور نظام کو پیش کی، اس نظم کا پہلا شعر ہمیں یاد ہے ؎

شاہِ اسلام کے دربار میں دس سال کے بعد
لعل لایا ہوں نہ یاقوت و گہر لایا ہوں

مولانا حیدر آباد سے اجڑ کر بمبئی پہنچے، یہاں انھوں نے مولانا ابو الکلام آزاد، خواجہ حسن نظامی، آغا حشر کاشمیری کے ساتھ مل کر ایک تبلیغی اور علمی ادارہ قائم کیا اور اس میں یہ سب حضرات اپنی صلاحیتوں کو صرف کرتے رہے، ادھر مولانا کے والد مولانا کو پنجاب بلا کر اپنے اخبار "زمیندار" کے فرائض ادارت سونپنے پر مصر تھے جو مولوی سراج الدین صاحب نے اپنی سرکاری ملازمت ختم کر کے کرم آباد سے نکالا تھا اور بڑی کامیابی کے ساتھ جاری تھا مولانا پنجاب آئے اور آپ نے لاہور سے پہلے "زمیندار" ہفتہ وار اور پھر اسے روزانہ نکالا۔

مولانا بے مثال نعت گو، وقتی حالات پر انتہائی زود گوئی کے ساتھ نظم کہنے والے شاعر، عربی فارسی کے پختہ مترجم اور اردو کے دہلی اور لکھنو اسکولوں کے اداشناس تھے، ان کو فارسی اور اردو پر پوری قدرت حاصل تھی یہ نہیں کہ جن لوگوں نے ان کے حلقہ ادارت میں تحریری کام کیا وہ اردو زبان اور صحافت کے ماہر بن گئے۔ بلکہ واقعہ یہ ہے کہ جن ہزاروں ناظرین نے "زمیندار" کا مطالعہ کیا ان کو بھی اردو سے واقفیت ہو گئی۔

مولانا اگرچہ پنجابی تھے مگر لکھنؤ، دہلی اور فیض آباد کے گھروں میں بولی جانے والی اردو کے ایک ایک محاورہ پر ان کی نظر تھی، بے مثال طنز نگار اور ہجو گو تھے، طبیعت میں روانی اس بلا کی تھی کہ ہر روز دو چار بلند پایہ نظم کہہ دینا ان کا معمول تھا اور ہر نظم زبان و بیان کے لحاظ سے جدت اور طنز و شوخ بیانی میں بے مثال ہوتی تھی۔ اپنی پچاس سال کی صحافتی اور سیاسی زندگی کا شاید ہی کوئی واقعہ ایسا ہو جس پر مولانا نے نظم نہ کہی ہو، ان کے اشعار اور مجموعۂ کلام کو یاد رکھنا بہت مشکل کام ہے، مگر ہم یہاں ان کا کوئی کوئی شعر

اور کوئی کوئی مصرعہ ضرور دہرائیں گے۔

گاندھی جی کی قیادت پر مولانا نے اس دور کے اور مسلمان رہنماؤں کی طرح اپنے مکمل اعتماد کا اظہار کیا، چنانچہ گاندھی جی کے متعلق ان کی کئی نظمیں ہیں ایک نظم کے چند اشعار یہ ہیں ؎

گاندھی جی نے آج جنگ کا اعلان کر دیا
باطل سے حق کو دست و گریبان کر دیا
سر رکھ دیا رضائے خدا کی حریم پر
خنجر کو پھر حوالۂ شیطان کر دیا
پروردگار نے کہ وہ ہے آدمی شناس
گاندھی کو بھی یہ مرتبہ پہچان کر دیا

سردار پٹیل نے جب باردولی میں ستیہ گرہ کی مہم چلائی تو مولانا نے کہا ؎

نہ بم سے ڈرا اور نہ پستول سے ؞ ہے جیوٹ بلا کا ہمارا پٹیل

سردار بھگت سنگھ کی سرفروشی اور حب الوطنی پر مولانا کی کئی نظمیں ہیں ایک جوش آفریں نظم کا شعر ہے ؎

شہیدانِ وطن کے خونِ ناحق سے جو ست نکلے
تو اس کے ذرہ ذرہ سے بھگت سنگھ اور رٹ نکلے

مشہور شعلہ بار مقرر اور مجاہد وطن سید عطاء اللہ شاہ بخاری ان کے ممدوح بھی رہے اور کسی کسی وقت سیاسی اختلافات کی وجہ سے مولانا نے ان کے خلاف بھی لکھا، بخاری صاحب کے متعلق مولانا کا ایک شعر ہے کہ ؎

چھائے ہیں مجلسوں میں بخاری کے زمزمے
بلبل چہک رہا ہے ریاضِ رسول میں

اور لاہور کی مسجد شہید گنج کے زمانہ میں جب مولانا بخاری صاحب سے بگڑے تو فرمایا کہ ؎

پہلے ہی دن سے جب دبدبے بخاری کے بیٹھ
مانگتے پھرتے ہو کیوں کا جل سیاسیات کا
خالصہ کا ساتھ دے جب یہ شریعت کا امیر
کیوں نہ کہیے اس کو باباٹل سیاسیات کا

اسی نظم میں سید عطاء اللہ شاہ بخاری کی مذہبی اور سیاسی جماعت مجلس احرار کے ہر لیڈر کی تواضع میں مولانا نے ایک ایک شعر کہا ہے، مولانا مظہر علی مظہر اور چودھری افضل کے متعلق ارشاد ہوا ؎

مجلس احرار کے نیفہ کی رونق بن گیا
ایک پٹو دوسرا کھٹمل سیاسیات کا

مولوی داؤد غزنوی یاد آگئے تو فرمایا ؎

جل گئے کلہ میں بھٹے مولوی داؤد کے
حد سے زیادہ گرم تھا بھوبھل سیاسیات کا

شیخ حسام الدین اور ڈاکٹر کچلو پر بھی تیر اندازی ہوئی ؎

ڈاکٹر کچلو زبر ہیں اور حسام الدیں ہیں زیر
یہ دمن اس عہد کی دونل سیاسیات کا

ڈاکٹر اقبال مولانا ظفر علی خاں کے بہت قریبی دوست تھے، عمر بھر کا ساتھ تھا، مگر سیاسیات میں مولانا کسی کو نہ بخشتے تھے، ڈاکٹر اقبال کو انگریزی حکومت نے جب "سر" کا خطاب دیا تو مولانا بگڑ گئے، ایک مخالفانہ نظم ہوئی جس کا ایک مصرعہ تھا ؎

"قوم کی لٹیا ڈبوئی کس نے" سر اقبال نے"

ڈاکٹر اقبال کا انتقال مولانا کی زندگی میں ہوا، اس وقت مولانا نے

بڑے تاثر سے فرمایا ؂

گھر گھر یہی چرچا ہے کہ اقبال کا مرنا
اسلام کے سر پر ہے "قیامت" کا گذرنا
عرش سے تا فرش المناک فضا ہے
اس غم میں سیہ پوش ہیں بغداد و سمرنا

احرار لیڈر چوہدری افضل حق کی سیاست پر اکثر مولانا نے اعتراض کئے وہ ان کے طنز و ہجو گوئی کے بار بار نشانہ بنے مگر مولانا سیاسیات میں ایک بہادر اور حوصلہ مند مخالف تھے۔ مخالفت کے اسباب کے سامنے آنے پر کڑی مخالفت کرتے اور ان کے اسباب ہٹ جانے پر ان کا دل بالکل صاف ہو جاتا، چنانچہ چوہدری افضل حق کے انتقال پر انھوں نے لکھا ؂

رونق کاشانۂ احرار افضل حق سے تھی
مستی خمخانۂ احرار افضل حق سے تھی
ذرہ ذرہ کہہ رہا ہے وادیٔ کشمیر کا
کامیاب احرار کی یلغار افضل حق سے تھی
اک کرشمہ ہے یہ اس کی ہمت مردانہ کا
لرزہ براندام اگر سرکار افضل حق سے تھی

مشہور صحافی، مصنف اور اہل قلم، مولانا غلام رسول مہر اور عبد المجید سالک مولانا ظفر علی خاں کے شاگرد تھے، عرصہ تک یہ دونوں اخبار "زمیندار" کے حلقہ ادارت میں شامل رہے۔

مولانا ظفر علی خاں کے منٹگمری کے دوران قید میں ان کے فرزند اختر علی خاں صاحب سے لڑ بھڑ کر مرتضیٰ احمد خاں میکش، سید اظہر حسن زاہدی، حفیظ جالندھری اور پروفیسر تاثیر وغیرہ کے تعاون سے

انھوں نے لاہور سے اپنا اخبار "انقلاب" نکالا، جو تقسیم کے بعد تک بڑی دھوم دھام کے ساتھ چلتا رہا۔ "انقلاب" کے اجراء پر منٹگمری جیل ہی سے فرمایا۔

مہر و سالک جدا ہوئے ہم سے ؛؛ انقلابات ہیں زمانے کے

مدت دراز تک مولانا اور مہر و سالک کے درمیان نوک جھونک چلتی رہی مولانا نے ایک دفعہ کلکتہ سے مہر و سالک پر بمباری کی فرمایا کہ

مہر و سالک بھی پرستش گائے کی کرنے لگے
سامری ہے انقلاب اور جان بل گوسالہ ہے
مہر ان کی ہے دوات اور سالک ان کا ہے قلم
ایک اسم ظرف ہے اور ایک اسم آلہ ہے
ان کے رشتے جس قدر ہیں سب کے سب دلچسپ ہیں
التباس ان کا چچا اور تزویر ان کی خالہ ہے
ان کی حکمت لندنی ہے اور نوزائیدہ ہے
میری حکمت یثربی ہے اور دہ صد سالہ ہے
جب اچھالوں گا تو دونوں کے دھوئیں اڑ جائیں گے
میرے تھیلے میں ترنج جادوئے بنگالہ ہے

مولانا بشیر احمد بھٹہ ۱۹۳۷ء میں مسلم لیگی امیدوار کے مقابلہ میں کانگرس کی طرف سے اسمبلی کے امیدوار تھے، مولانا ظفر علی خاں اس وقت میرٹھ تشریف فرما تھے فرمایا کہ

اگر مینہ زور سے برسا تو گل جائیں گی دیواریں
کہ اینٹیں ساری کچی ہیں بشیر احمد کے بھٹہ کی

(اس میں مولانا بشیر احمد کی اینٹوں کے بھٹہ سے تلمیح کی گئی ہے، مولانا بشیر احمد صاحب بھٹہ لگانے اور اینٹیں بنانے کا کام کرتے تھے۔

تلوک چند محروم کے اعزاز میں لاہور کے ادیبوں اور شاعروں نے

ایک تقریب منعقد کی، مولانا ظفر علی خاں اس موقع پر تشریف فرما تھے، فرمایا کہ ؎

وہ کون ہے نہ ملا جس کو بوسہ لب لعل
تلوک چند ہی بیچارہ رہ گیا محروم

خواجہ حسن نظامی سے رئیس الاحرار مولانا محمد علی جوہر کی طرح مولانا ظفر علی خاں کی بڑی اکھاڑ پچھاڑ رہتی تھی۔ مولانا عربی اور فارسی آمیز زبان میں اپنے نوادرات خواجہ صاحب کو پیش کرتے اور خواجہ صاحب اپنے اخبار "منادی" میں اپنے روزنامچہ میں ہلکی پھلکی اردو میں اس کا جواب دے جاتے اہل ذوق و صاحب طرز ادیبوں اور قلم کاروں کی اسی چھیڑ چھاڑ سے مزہ لیتے اور دونوں متقابل اخبارات "منادی" اور "زمیندار" کا شوق کے ساتھ مطالعہ کرتے تھے، مولانا نے ایک دفعہ فرمایا ؎

صوفی بھی ہیں رئیس بھی ہیں اور ملنگ بھی
اور خواجہ جانتے ہیں تجارت کا ڈھنگ بھی

شورش کاشمیری مولانا ظفر علی خاں کے حلقہ ادارت کے ایک اہل قلم ہیں مولانا کی زندگی میں وہ بالکل نوعمر تھے مگر تھے ہونہار طبیعت کے، اس لئے انھوں نے مولانا سے کافی استفادہ کیا" شورش" ایک دفعہ لمبی مدت کے لئے قید ہو گئے، مولانا نے شورش کو تھپکی دی اور شاباش کہی، فرمایا ؎

کیا حکومت نے چند دن کیلئے جو زنداں میں بند تجھ کو
تو شکر حق کر کہ راہِ حق میں پہنچ رہا ہے گزند تجھ کو
حسین کا سر ہے آسماں پر جو تھا کل کبھی سناں پر
تو کم سے کم سر بکف تو ہو جا جو سر کہ کرتا ہے بلند تجھ کو

یہ طنز نگاری اور ہجو گوئی مولانا کی زندگی کا صرف ایک پہلو ہے، افسوس ہے کہ میں اسے تفصیل کے ساتھ اس لئے نہیں پیش کر سکتا کہ مولانا

مطبوعہ مجموعہ کلام میری دسترس سے باہر ہے، اس وقت جو کچھ کہہ رہا ہوں اپنی یادداشت سے، حقیقت یہ ہے کہ مولانا بہت بڑے مصنف، انگریزی کے مترجم، قدماء کی طرح قادر الکلام نعت گو، صف اول کے صحافی اور مقالہ نگار ملک کے ایک جادو بیان مقرر اور آزادی وطن کے زبردست فدا کار تھے۔

مولانا کی زندگی کے کم و بیش پندرہ برس جیل خانوں میں گذرے، پورے ہندوستان میں صرف ان کا اخبار "زمیندار" تھا جو بار بار حکومت کا نشانۂ قہر و عتاب بنا۔ کئی دفعہ ان کی پریس ضبط کی گئی اور چار پانچ لاکھ روپیہ انھیں قرقیوں اور ضمانتوں کی شکل میں حکومت کو ادا کرنا پڑا، یہ اخبار "زمیندار" پچاس سال تک ایک بجلی بن کر آزادی اور حریت پسندی کے دشمنوں پر گرتا رہا، اس پچاس برس کے عرصہ میں سینکڑوں تعلیم یافتہ نوجوان تھے جو ادارہ "زمیندار" سے منسلک رہ کر اردو کے صحافی اور اہل قلم بنے، مولانا کے معتقدین اور شاگردوں کی ایک لمبی فہرست ہے جو اس قابل ہے کہ مختصر تعارف کے ساتھ ایک الگ مضمون کی شکل میں شائع کی جائے۔

مولانا نے اپنی زندگی میں ہر سیاسی اور قومی تحریک کی رہنمائی کی، کبھی وہ جنگ طرابلس کے لئے چندہ مانگتے نظر آتے ہیں، کبھی خلافت عثمانیہ کے سقوط پر نالہ کناں ہیں، کبھی ابن مسعود کے مخالف ہیں، کبھی ابن سعود کی حمایت کر رہے ہیں۔ کانگریس سے ان کا رشتہ بہت گہرا تھا، عرصہ تک وہ کانگریس کی پنجابی ٹولی کے سربراہ رہے، جس میں ڈاکٹر شیخ محمد عالم، ڈاکٹر کچلو، ڈاکٹر ستیہ پال، ڈاکٹر گوپی چند بھارگو، مولانا عبدالقادر حضوری، مولانا حبیب الرحمن لدھیانوی، سید عطاء اللہ شاہ بخاری، چوہدری افضل حق، شیخ حسام الدین خواجہ عبدالرحمن غازی، لالہ راجپت رائے وغیرہ شامل تھے سربراہ رہے آخر میں ان کو کانگریس سے اختلاف پیدا ہو گیا تھا اور وہ مسلم لیگ میں شامل ہو گئے تھے۔

مولانا ہر چھوٹی بڑی قومی تحریک میں برابر حصہ لیتے تھے، مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ایک دفعہ دہلی میں فتحپوری کی مسجد میں پشتہ کا ایک جھگڑا ہو گیا، عمارت کے پیچھے یہ پشتہ مسجد کا تھا، مسجد کے متولیوں کی رضامندی سے ایک اور شخص نے اس پر قبضہ کر لیا، مولانا پنجاب سے اپنے دو دو سو لمبے تڑنگے رضا کار لے کر دہلی آئے اور صرف اسی پشتہ کو بچانے کے لئے انھوں نے باقاعدہ تحریک چلائی۔ ایک پوری نسل ہے جو مولانا کی تقریر و تحریر سے متاثر ہوئی، افسوس ہے کہ ہماری نئی نسل نے ان ایثار پیشہ حضرات کو بھلا دیا ہے جن کی قومی اور سیاسی خدمات کے بار احسان سے ہماری کمر خم ہے اور جن کی محنتوں کا پھل آزادی کی شکل میں ہم آج پا رہے ہیں۔

مولانا کی نعتیں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی سے والہانہ محبت کے ساتھ تخیل کی پرواز، نئے نئے مضامین کی کثرت، تراکیب کی بندش الفاظ کے در و بست، استادانہ مشق و مہارت اور قادرالکلامی کا بڑا اچھا نمونہ ہیں، پھر ان نعتوں میں مولانا قرآن و حدیث کے مضامین علمیہ کو بڑی خوبصورتی کے ساتھ ادا کرتے چلے جاتے ہیں، مولانا کی نعتیں اتنی باوقار اور عالمانہ ہیں کہ ان کے سیاسی کلام کو سامنے رکھ کر یہ پہچاننا مشکل ہو جاتا ہے، کہ یہ ایک ہی شخص کا کلام ہے یا ان کے کہنے والے الگ الگ دو شخص ہیں۔

میں اس مضمون کا اختتام مولانا کی ایک نعت پر کرتا ہوں جس سے مولانا کی نعت گوئی کی ایک جھلک سامنے آ سکتی ہے ؎

وہ شمع اجالا جس نے کیا چالیس برس تک غاروں میں
اک روز جھمکنے والے تھی سب دنیا کے درباروں میں

جو فلسفیوں سے کھل نہ سکا اور نکتہ وروں سے حل نہ ہوا
وہ راز کملی والے نے بتلا دیا چند اشاروں میں!

گر ارض و سما کی محفل میں لولاک لما کا شور نہ ہو
یہ رنگ نہ ہو گلزاروں میں یہ نور نہ ہو سیاروں میں
ہیں کرنیں ایک ہی مشعل کی بوبکر و عمر عثمان و علی
ہم مرتبہ ہیں یاران نبی کچھ فرق نہیں ان چاروں میں

مولانا کی ایک اور کیف آور نظم یاد آرہی ہے ؎

اک جہانِ رنگ و بو خود مرا خیال تھا
گوشۂ قفس مجھے عالم مثال تھا

رات شاہ بازِ فکر لے گیا کہاں کہاں
خود تو بہ شکستہ پر گستہ بال تھا

چھپ چکا تھا آفتاب ضوفشاں تھا ماہتاب
کائنات کا مزاج رو بہ اعتدال تھا

گوہ و دشت و بام و در غرق موج نوا تھے
بسکہ ماہ نیم ماہ بن چکا ہلال تھا

چاک تھی قبائے گل بے نقاب تھے نجوم
بے نقاب ہر طرف حسن لایزال تھا

دیکھتا تھا میں جدھر سربسجدہ تھے شجر
ڈال ڈال پات پات ذکر ذوالجلال تھا

عرش و فرش مست تھے اپنے اپنے رنگ میں
کیا کہوں مگر کہ کیا میرے دل کا حال تھا

وہ زمانہ پھر گیا یک بیک نگاہ میں!
جب ہر ایک حق پرست بوذر و بلال تھا

جب نبی کے نام پر جسم و روح تھے نثار
جب خدا کی راہ میں وقف جان و مال تھا

جامِ جم سے بے نیاز تھی شراب خانہ ساز ٭ میکشوں کا چارہ ساز ساغرِ سفال تھا
باغ میں وہی بہار پھر نہ آئے گی کبھی حاملانِ عرش سے یہ مرا سوال تھا

مولانا کی ایک اور نظم بھی زبانِ قلم پر آرہی ہے ؎

مجھے بھی انتساب ہے ادب کے اس مقام سے
ملی ہوئی ہے جس کی حد قدم گہہ نظام سے

عرب کے تاجدار پر خدا کی لاکھ رحمتیں
ہماری سب روایتیں ہیں زندہ جس کے نام سے

ہوا غمِ جہاں کا قل، پڑا ہے میکدہ میں غل
کہ عقدِ سانگین حل بندھا ہے دورِ جام سے

ٹپک رہی ہیں مستیاں شراب خانہ ساز کی
تتار و ہند و مصر سے عراق و نجد و شام سے

اگر ہے شکوہ رند کو تو ہے تجھی سے ساقیا
شکستِ توبہ کو گلہ نہیں ہے اہتمام سے

نبی کی بارگاہ میں صبا یہ جا کے عرض کر
کہ سرگراں ہے آسماں حضور کے غلام سے

اگرچہ لغزشیں مری پسند کی مستحق نہیں
نہیں ہوں نا امید میں خدا کے لطفِ عام سے

سنا ہے برق بن کے پھر گرے گی فرقِ کفر پر
وہ تیغ جو کبھی خجل ہوئی نہ تھی نیام سے

جہانِ اجتہاد میں سلف کی راہ گم ہوئی
ہے تجھ کو اس کی جستجو تو پوچھ ابوالکلام سے

میں بے نیاز مرد ہوں صلہ کی آرزو نہیں
کسی کو فکر نام کی مجھے غرض ہے کام سے

مولانا غلام رسول مہر

پاکستان میں جو فوجی ٹولہ برسر اقتدار آیا تھا اس کا انجام تو وہ ہے جو اب سامنے آچکا ہے اور اسی کا آغاز یہ تھا کہ اس نے برسر اقتدار آتے ہی اپنے اخبارات و رسائل ہندوستان بھیجنے اور یہاں کے اخبارات و رسائل کے پاکستان پہنچنے پر شدید پابندی لگا دی تھی، گذشتہ ڈیڑھ برس میں اس علم و ادب دشمنی پر احتجاج کیا گیا، مگر پاکستان حکومت نے کوئی اثر نہیں لیا پاکستانی اخبارات و رسائل کے یہاں نہ آنے سے بڑا نقصان یہ رہا کہ یہاں کے عوام پاکستان کے حالات سے بے خبر رہے، اسی بے خبری کا نتیجہ یہ ہوا کہ مشہور ادیب صحافی اور نامور محقق مولانا غلام رسول مہر نے انتقال فرمایا اور اہل ہندوستان اس حادثہ سے بے خبر رہے۔

مہر صاحب کے انتقال کی خبر سنکر تقسیم ملک سے پہلے کا سارا زمانہ اخبار زمیندار اور انقلاب میں ان کے سیاسی مضامین، غالب اور سید احمد بریلوی رحمۃ اللہ علیہ پر ان کی محققانہ تصانیف اور ان کی ژرف نگاہی، علمی اور تحقیقی ذوق، ان کی سیاسی بصیرت اور مسلمانوں کی اجتماعی سیاست پر ان کے نکر و قلم کی اثر اندازی، یہ سب چیزیں یاد آگئیں۔

مہر صاحب ضلع جالندھر کے رہنے والے تھے، شروع سے لکھنے پڑھنے کا ذوق تھا، اپنے وقت کے بے مثال ادیب و صحافی مولانا ظفر علی خاں کی طلب پر ایک اور مشہور صحافی آغا مرتضیٰ احمد خاں میکش انھیں جالندھر سے لاہور لے گئے اور ادارہ زمیندار سے منسلک کرایا

مہر صاحب بہت سوچ سمجھ کر کہنے کے عادی تھے، انھوں نے اور مرحوم عبدالمجید سالک نے اپنے زور قلم اور زوری طبع سے زمیندار کی صحافتی خصوصیات میں غیر معمولی اضافہ کیا۔ مہر صاحب معلومات اور مطالعہ کے عادی تھے، اس سلسلہ میں انھیں بڑا اہتمام تھا کہ کابل میں نعمت اللہ قادیانی کی قادیانی عقائد کی بنا پر سنگسار کرنے کا واقعہ پیش آیا تو اس پر مولانا محمد علی جوہرؒ نے اپنے اخبار "ہمدرد" میں حکومت کابل کے خلاف مضامین لکھے، اُدھر مولانا شبیر احمد عثمانی سابق صدر مہتمم دار العلوم دیوبند نے قتل مرتد پر ایک محققانہ تحریر قلمبند کی اور اس مسئلہ کی شرعی حیثیت بیان کی۔

مولانا مہر نے تار کے ذریعہ مولانا شبیر احمد عثمانی سے ان کی یہ تحریر طلب کی اور اپنے مضامین میں اس تحریر سے استفادہ کیا، ان کے سارے مضامین وقت نظر، وسعت معلومات اور تعمق فکر کا نتیجہ ہوتے تھے۔

سید احمد شہید علیہ الرحمۃ اور غالب پر ان کی کتابیں، تحقیقی محنت اور وسیع مطالعہ کا پتہ دیتی ہیں۔ سید صاحب کے حالات لکھنے کے دوران کئی دفعہ انھوں نے بالاکوٹ کا سفر کیا اور وہاں کی سرزمین کا ایک ایک گوشہ ناپ ڈالا اور اس کی جغرافیائی حیثیت کو آئینہ بنا کر پیش کیا۔

تقسیم کے بعد مہر صاحب اخباری دنیا سے بڑی حد تک کنارہ کش ہو چکے تھے اور صرف تصنیف و تالیف اور تاریخی تحقیق کے کام پر لگ گئے تھے، افسوس ہے کہ اس دور میں پاکستان نے ان کی مناسب قدر نہ کی، سنتے ہیں کہ اس حصہ زندگی میں مالی مشکلات کا سامنا بھی رہا، یہ ایک عظیم صحافی، مصنف اور محقق تھا جس نے ۳۰، ۳۵ سال تک اپنے قلم سے اردو صحافت کو بچپن سے نکال کر جوانی کی توانائیوں سے ہمکنار کرنے میں

محنت کی اور پوری عمر مسلمانوں کی خدمت، علم و ادب کی آبیاری اور تصنیف و تالیف کی مہمات میں بسر کی، پاکستانی اگر ان کی مناسب قدر کرتے تو یہ خود اس ملک کی علم دوستی کی ایک مثال ہوتی، مگر ہمیں مجبوراً یہی کہنا پڑتا ہے کہ پاکستان برے لوگوں کے ہاتھوں میں پڑ گیا ہے، جن کو نہ علم و ادب کا شعور ہے نہ سیاست و حکمرانی کا پتہ اور نہ وہ اپنے ملکی اور ملی فرائض پر آگاہ ہیں، بس اول و آخر انھیں اپنا ذاتی اقتدار اور عیش پرستی ان کے پیش نظر ہے۔

مولانا مہر مرحوم کے مرحوم ڈاکٹر سر محمد اقبال سے بھی خاص تعلقات تھے، چنانچہ پہلی گول میز کانفرنس میں وہ ڈاکٹر اقبال کے پرسنل سکریٹری کی حیثیت سے لندن گئے تھے، ڈاکٹر اقبال نے ایک سفر کابل، غزنی اور قندہار کا بھی کیا تھا اس وقت علامہ سید سلیمان ندوی اور سر سید کے نامور پوتے سر راس مسعود اور مولانا غلام رسول مہر ان کے ہمرکاب تھے۔ بال جبریل اور ضرب کلیم کی کئی نظمیں ڈاکٹر اقبال کے اس سفر کی یاد تازہ کرتی ہیں۔

غرض کہ مہر صاحب گوناگوں خصوصیات کے حامل تھے، راقم الحروف صرف ایک دفعہ لاہور میں بتوسط مولانا عبدالمجید سالک ان سے ملا ہے مگر کبھی ان سے خط و کتابت کی نوبت نہیں آئی، ان کے متعلق میری معلومات صرف ان کے اخبار اور ان کی تصانیف کے ذریعہ تھیں، حق تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے۔ آمین بڑی قابلیت اور خصوصیت کے آدمی تھے، اب اس دور میں تو انسان بھی سستا ہے اور عمومی طور پر انسان کی قابلیت، ذہنی صلاحیت اور اس کا حاصل کردہ علم، اخلاق سب سستے بن کر رہ گئے ہیں، یہ پچھلے دور کے لوگ تھے جنھوں نے علم کو علم کے طور پر حاصل کیا تھا اور ان کی زندگی اپنی ایک گہرائی، ایک وزن، اور ایک حیثیت رکھتی تھی۔

مولانا مظہر علی اظہرؔ

اخبارات میں مولانا مظہر علی اظہر کے انتقال کی خبر پڑھ کر دل کو ایک دھکا سا لگا، وہ متحدہ ہندوستان کی فعال جماعت مجلس احرار کے رکن رکین سید عطاء اللہ شاہ بخاری، چوہدری افضل حق، مولانا حبیب الرحمٰن اور مولانا داؤد غزنوی کے ساتھی تھے، اول اول ان کا نام ۱۹۳۱ء میں تحریک حریت کشمیر کے سلسلہ میں سامنے آیا جب وہ راولپنڈی سے کشمیر جانے والی سڑک کے وسط میں کوہالہ کے پل پر انگریزوں اور مہاراجہ کشمیر کی فوج اور پولیس سے متصادم ہو کر اپنے سینکڑوں رضاکاروں کے ساتھ ریاست کشمیر کی حدود میں داخل ہونے میں کامیاب ہو گئے تھے۔

میں نے مرحوم کو صرف دو دفعہ دیکھا، ایک دفعہ دفتر مجلس احرار لاہور میں جب وہ اس عمارت کی بالائی منزل پر چوہدری افضل حق اور مولانا حبیب الرحمٰن سے آنند بھون سے آئے ہوئے جواہر لال نہرو کے ایک خط پر مشورہ کر رہے تھے، یہ شاید ۱۹۲۶ء کا واقعہ ہے، دوسری دفعہ لاہور ہی میں ڈاکٹر عبد القوی لقمان کے مکان پر ایک دعوت میں جہاں مفسر قرآن مولانا احمد علی، ملک نصر اللہ خاں عزیز، مولانا داؤد غزنوی وغیرہ بھی موجود تھے، مولانا مظہر علی اظہر کا بوٹا سا قد، چھریرا بدن، پوری زندگی میں چستی اور جلد بازی تھی، اعلیٰ تعلیم یافتہ اور ہائی کورٹ لاہور کے کامیاب ایڈووکیٹ تھے، تقریر میں بڑی روانی تھی، تاریخ اور سیاست پر گہرا مطالعہ تھا، ان کی کوئی تقریر دلائل اور مطالعہ سے خالی نہیں

ہوتی تھی۔

میں نے مجلس احرار کے روزنامہ اخبارات روزنامہ "حریت" جس کے ایڈیٹر سید اظہر حسن زاہدی بی، اے اور علامہ حسین میر کاشمیری تھے، روزنامہ "احرار" اور روزنامہ "مجاہد" میں مولانا مظہر علی اظہر کے نظم ونثر کے بہت مضامین پڑھے، وکیل، مقرر، لیڈر ہونے کے ساتھ وہ نہایت باخبر اخبار نویس بھی تھے، بڑے اچھے شاعر اور اہل قلم بھی۔

قیام پاکستان کے وہ شدید مخالف تھے، ان کی آواز وہ آخری آواز تھی جو پاکستان بننے تک پاکستان کی مخالفت میں بلند ہوتی رہی، انھوں نے پاکستان کے خلاف ایک بڑی معرکۃ الآرا کتاب بھی لکھی تھی، جس کا پُرمغز حصہ وہ تھا جہاں انھوں نے ہندوستان میں رہ جانے والی اقلیت پر بحث کی تھی۔

مرحوم عبدالمجید سالک۔ ایڈیٹر انقلاب نے اپنے مسخرہ پن میں کئی دفعہ مولانا مظہر علی اظہر کو اپنے ادارتی کالم "افکار وحوادث" میں مولوی اِدھر علی اُدھر" لکھا، مگر یہ صرف پھبتی تھی جس میں کوئی وزن نہ تھا میرے سیاسی مطالعہ کے اعتبار سے مظہر علی اظہر بڑے مستقل نظریات کے انسان تھے، جنھوں نے اپنے نظریات کے ضروری حصہ میں کوئی کاٹ چھانٹ نہیں کی تھی۔

مولانا مظہر علی اظہر تقسیم کے بعد سیاسیات سے الگ ہو گئے تھے، مگر اس سے پہلے کم وبیش ۳۰ سال تک وہ عرصۂ سیاست پر چھائے رہے کبھی انگریزوں سے نبرد آزما تھے، کبھی سر فضل حسین اور قادیانی نائب امام چوہدری ظفراللہ خاں سے دست وگریباں تھے، کبھی مولانا ظفر علی خاں سے کشتی لڑتے تھے، کبھی کشمیر اور کپورتھلہ کی ریاستوں پر حملہ کرتے تھے، وہ ان مخلص رہنماؤں کی آخری یادگار تھے جنھوں نے بڑی محنت اور جانفشانی کے

ساتھ ملک اور قوم کی خدمت کی، افسوس ہے کہ خلوص اور بے غرضی کے یہ نمونے ایک ایک کر کے رخصت ہو گئے ؎

حیف ہے وہ بھی نہ چھوڑی تو نے اے بادِ صبا
یادگارِ رونقِ محفل تھی پروانے کی ذات

دہلی میں ہمارے محترم خان غازی کابلی ہیں جنہیں مولانا مظہر علی اظہر کی طویل رفاقت حاصل رہی ہے۔

دوسرے ہمارے ساتھی مولانا انور صابری، مولانا خلیل الرحمٰن لدھیانوی اور مشہور کشمیری لیڈر چوہدری محمد شفیع راجوری۔ یہ چند حضرات اب ہندوستان میں مجلسِ احرار کے لٹے پٹے کارواں کی آخری نشانیوں میں سے ہیں ؎

ڈھونڈو گے اگر ملکوں ملکوں ملنے کے نہیں نایاب ہیں ہم
تعبیر ہے جس کی حسرت و غم اے ہمنفسو وہ خواب ہیں ہم

جناب روشن صدیقی مرحوم

مشہور شاعر جناب روشن صدیقی مرحوم سے راقم الحروف کی گذشتہ ۳۵ سال سے شناسائی تھی، طبقۂ شعراء میں ہی، کسی شاعر کی شخصیت، اخلاق، کردار اور معصومیت سے اتنا متاثر نہیں تھا جتنا جناب روشن سے وہ ایک شریف ترین انسان، صاحب دل، باصفا، باخدا اور پاکیزہ سیرت کے بزرگ تھے، پوری زندگی نیکی، سادگی اور شرافت میں ڈوبی ہوئی تھی نظر میں معصومیت، حیا، گفتگو میں شیرینی، اور حلاوت، اخلاق میں پختگی اعمال میں سچائی تھی۔ مشاعرہ چاہے کتنی بھی شان و شوکت سے جم رہا ہو اور غزل پڑھنے کے لئے ان کا نمبر آگیا ہو لیکن نماز کا وقت اگر آگیا ہے تو وہ فوراً مشاعرہ چھوڑ کر قریب کی مسجد میں پہنچیں گے اور خشوع و خضوع سے نماز ادا کریں گے

یہ منظر میں نہیں بھولتا کہ ابھی دو ڈھائی برس ہوئے وہ تھوڑے سے وقفہ کے لئے دیوبند آئے اور مرحوم مولانا محمد ابراہیم صاحب سابق صدر المدرسین دار العلوم کے یہاں فروکش ہوئے۔ ایک مجلس میں مولانا مرحوم نے روشن صاحب سے نعت سنانے کی فرمائش کی، مولانا کے زائد اصرار پر روشن صاحب باہر گئے، وضو کی، واپس آکر کرسی پر نہیں بلکہ تخت پر دو زانو بڑے ادب کے ساتھ بیٹھے اور بڑی کیفیت کے ساتھ ایک نعت مرحمت فرمائی، ذکر رسول کے لئے ان کا یہ ادب اور اہتمام ایک عطیۂ الٰہی تھا،

ایک سعادت تھی زندگی کی ایک روشنی تھی، اور ایک دارین کی دولت لازوال۔

مجھے خوش قسمتی سے طبقۂ شعراء سے زیادہ قریب ہونے کا موقع نہیں ملا بس جناب جگر مرادآبادی، جناب سیماب الہ آبادی، مولانا تاجور نجیب آبادی مرحوم اختر شیرانی مرحوم، زائرِ حرم حمید صدیقی مرحوم، جناب ماہر القادری، جناب شفیق جونپوری مرحوم۔ ان لوگوں سے بہت کم ملاقات اور اکثر خط و کتابت رہی ہے۔ دور دور سے اس دور کے شعراء کے جو حالات اور ان کی بے ہنگم زندگی کی جو تفصیل میں سنتا رہا اس کی بنا پر مجھے صفائی کے ساتھ کہنا چاہیئے کہ اس طبقہ سے مجھے نفرت اور ایک طرح کی چڑ رہی، مگر انہی کے درمیان مرحوم جناب روشؔ کی زندگی میرے لئے رشک کا باعث تھی، ان کی شرافت میں ان کے ملنے والوں کے لئے ایک سبق تھا اور ان کی نیکی اور پرہیزگاری قابل تقلید تھی، جناب روشؔ کی وفات کا سانحہ واقعتہً ایک حسرت ناک سانحہ ہے۔ بقول میرؔ ؎ مصائب اور تھے پر دل کا جانا

عجب اک سانحہ سا ہو گیا ہے

ان کی غزل میں رچاؤ تھا، پختگی تھی، ہلکے ہلکے فکر و خیال کی ایک کیفیت تھی، لب و لہجہ میں بڑی دلکشی تھی، نگہ آفاق و انفاس تک پہنچتی تھی، جو کچھ کہتے تھے بڑی پختگی کے ساتھ کہتے تھے اور بڑی بات یہ کہ ان کی غزل ان کی زندگی کی طرح معصوم، بے عیب اور بے شکن تھی، ان کی غزل میں ایک کنواری لڑکی کی حیا، ایک نو عروس کی مسکراہٹ، ایک شریف دولہا کا وقار، چاندنی راتوں کا جمال، حسین ماتھوں کی چاندنی اور انجیل و زبور جیسی الہامی کتابوں کا تقدس تھا۔

میں بڑے خلوص کے ساتھ جناب روشؔ کیلئے دعاءِ مغفرت کرتا ہوں، دیگر احباب سے بھی گذارش ہے کہ وہ مرحوم کیلئے دعاءِ مغفرت اور ایصالِ ثواب فرمائیں کہ مرنے والے کی سب سے بڑی تعزیت اور سب سے بڑی ہمدردی بھی یہی ہے۔

مسعودہ مرحومہ کے مزار پر!

چھپنے والی صورتوں کو دے نہ الزامِ حجاب
خاک میں کر دی گئیں پنہاں کہ پنہاں ہو گئیں

گذشتہ جولائی میں مجھے ایک تقریب میں شرکت کیلئے نانوتہ جانے کا اتفاق ہوا، ۲۳ کی صبح کو سحر دم مسعودہ کے مزار پر فاتحہ خوانی کی سعادت حاصل ہوئی۔ سہارنپور جانے والی پختہ سڑک سے ملا ہوا خود مسعودہ مرحومہ کے خاندان کا ایک باغ ہے۔ یہی باغ مسعودہ مرحومہ کی آخری آرام گاہ ہے۔ باغ میں آم کے لمبے لمبے درخت ہیں، اور زمین پر برسات کی وجہ سے غیر مرتب گھاس کے خودرو انبار جمع ہیں۔ پہلے مسعودہ کی شہید والدہ کی قبر ہے اور ساتھ ہی مسعودہ کا مزار ہے۔ فاتحہ خوانی کے بعد دیر تک میں اور میرے ساتھی مسعودہ کے بالین تربت پر سر جھکائے بیٹھے رہے صبح کا وقت تھا۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا کے نرم رو جھونکے اداس اور پژمردہ دل کو سنبھالا دینے کی کوشش کرتے تھے، حد نظر تک خاموشی اور سکوت تھا، ایک ایسی خاموشی جس میں افسردگی اور غم کی کیفیات گھل مل سی گئی تھیں ایک ایسا سکوت جس میں انسانیت پر ایسے شدید ظلم کے خلاف احتجاج گریہ وشیون کی آوازیں چھپی ہوئی تھیں۔ باغ کا یہ گوشہ پیمانہ درد کی پوری تاریخ پیش کر رہا تھا۔ جو ۴۷ء میں کھنڈہ سے شروع ہوا اور چند

انسانیت دشمنوں کے ظلم و جبر سے جس کی ابتدا ہوئی اس دور میں مسعودہ کی پاک روح کے لئے آلام و افکار کے ہزاروں خار چھپے ہوئے تھے، جنھوں نے اس باہمت لڑکی کی حیاتِ جسمانی کو مٹی کا ڈھیر بنا دیا، خبر نہیں کتنے کچو کے، کتنے چرکے کتنے زخم اور کس قدر خراشیں تھیں جن سے مسعودہ کا جسم زار و نزار ہو گیا تھا، چار سال کے بعد قیدِ روحانی و جسمانی کی اس زندگی سے نجات پا کر اس کا نانوتہ واپس آنا پھر سہارنپور میں سیشن جج کی عدالت میں اس کے مقدمہ کی کارروائی نانوتہ میں مسعودہ کی والدہ کی شہادت، مصائب و افکار کے مقابلہ میں مسعودہ کی پامردی، ایک مقصد اور ایک نصب العین کے لئے اس کی عظیم قربانی بہیمیت کے مقابلہ میں اس کی انسانیت پرستی کی فتح عظیم، مسعودہ کا ذاتی کردار، اس کا صبر و استقلال، دین سے اس کا غیر معمولی شغف اور حفاظتِ دین کے لئے اس کا لافانی جذبہ، یہ سب چیزیں اس تاریخ کی کڑیاں ہیں یہ تاریخ گذشتہ جون کی آخری تاریخوں میں مکمل ہو گئی۔

نانوتہ کی سرزمین اس عظیم الشان تاریخ کی سرمایہ دار ہے اور باغ کے اس گوشہ میں شرافت و انسانیت کی ایک روح، صدق و طہارت کا ایک نمونہ، غیرت و خودداری کی ایک تاریخ، اولوالعزمی اور مقصد پرستی کی ایک نظیر دفن ہے۔ مسعودہ کے ماموں حافظ عبد السلام صاحب نے بتایا کہ گذشتہ موسم سرما سے جب حافظ صاحب کے مکان پر حملہ اور فائرنگ کی واردات ہوئی، مسعودہ کوئی چاقو یا پھالی (کھیت میں کام کرنے کا آلہ) اپنے سرہانے رکھتی تھی۔ پوچھنے پر آپ نے بتایا کہ وہ ان بزدل حملہ آوروں سے خود مقابلہ کرنے کا ارادہ رکھتی ہیں۔

حافظ صاحب کا بیان ہے کہ پہلی دفعہ جب وہ اسے مغویہ عورتوں کے کیمپ سے لائے تو کیور سنگھ کے دونوں بچے اس کے ساتھ تھے حافظ صاحب نے اسے اجازت دی کہ وہ اگر چاہے تو ان بچوں کو ساتھ

لے سکتی ہے، لیکن اس نے جواب دیا کہ میں زبردستی کے ان بچوں سے کوئی تعلق نہیں رکھنا چاہتی۔ میری ماں نے اپنے کئی بچوں کے لئے صبر کیا، کیا میں ان دو بچوں کے لئے صبر نہیں کر سکتی۔

چار سال کی اس زندگی میں جو مسعودہ نے کپور سنگھ کے قبضہ میں گذاری اسے آلام روحانی کے ساتھ جسمانی اذیت بھی برداشت کرنی پڑی۔ کئی مرتبہ اسے کپور سنگھ نے زدوکوب بھی کیا، کوئی سختی اور کوئی تکلیف ایسی نہ تھی جو اس دور میں مسعودہ کو پیش نہ آئی مگر یہ مسعودہ کی اولوالعزمی تھی کہ اس نے سب مظالم کو انگیز کیا مگر اپنے ضمیر کے خلاف اس زندگی پر منظوری نہیں دی۔

ذاتی طور پر مسعودہ بے حد حلیم، بردبار، سنجیدہ، باغیرت لڑکی تھی۔ انگریزی، اردو، گورمکھی اور ہندی..... بے تکلف لکھ پڑھ سکتی تھی، شعر بھی کہہ لیتی تھی، اس کا ذہن اور عام زندگی دوسروں کے لئے ایک مثال تھا اس کے انتقال پر قصبہ کی سینکڑوں مسلم اور غیر مسلم عورتیں اس کے جنازہ پر آ کر جمع ہو گئیں، بہت سی عورتوں کو ولادت کا مرحلہ درپیش تھا مگر وہ چھلہ سے نکل کر مسعودہ کی صورت دیکھنے کے لئے حافظ صاحب کے گھر آئیں۔

تجویز ہے کہ مسعودہ کی یادگار میں ایک لائبریری اور ایک اسکول قائم کیا جائے۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ تجویز صرف مسلمانوں کی نہیں بلکہ انصاف پسند اور انسانیت دوست ہندوؤں کی بھی تائید کے قابل ہے۔

مسعودہ اپنے اوصاف کے لحاظ سے ہر ہندوستانی کے لئے قابل فخر لڑکی تھی، اس کی یادگار قائم کرنا اور اس کی یادگار کے سلسلہ میں ممکن امداد بہم پہنچانا انسانیت اور نیک کردار سے اپنے قریبی تعلق کے اظہار کا ایک زریں موقع ہے۔

میں مسعودہ کی قبر پر بیٹھا ہوا اس کی روشن اور تابناک زندگی کے مختلف پہلوؤں پر غور کرتا رہا۔ زندگی کی کوئی تکلیف ایسی نہ تھی مسعودہ کو

جس کا سامنا نہ کرنا پڑا۔

اس کی زندگی میں قتل و غارت گری کے ہنگامہ تھے، اغوا اور جبر و تشدد کے واقعات تھے، مظلومانہ بیکسی تھی، عدالتی سرگرمیوں کی دلخراش طوالت تھی، ماں، باپ، بہن اور بھائیوں کی موت پر خون کے آنسو تھے گھر سے جدائی کا افسوس تھا، اور انسانیت پر ظلم کرنے والے چند سنگدلوں کے جبر و تشدد پر مسلسل صبر تھا۔

مسعودہ کی زندگی کے اختتام کے ساتھ یہ ساری شورشیں دب گئیں یہ ہنگامے ختم ہو گئے۔ مسعودہ اب وہاں ہے جہاں کوئی شور نہیں۔ کوئی ہنگامہ نہیں، کوئی جھگڑا اور کوئی قضیہ نہیں ؎

کھو کر شورش عالم یہاں چلی آئے
بڑا سکون مرے گوشۂ مزار میں ہے

علامہ سید انور شاہؒ اور ڈاکٹر محمد اقبالؒ

علامہ جلیل حضرت مولانا سید محمد انور شاہ صاحبؒ اور اس دور کے ایک عظیم حکیم و فلسفی شاعر علامہ اقبال مرحوم کے درمیان تعارف و تعلق کے جو رشتے اور دوستانہ اخلاص و وفا کے جو روابط قائم تھے سینکڑوں باخبر اشخاص ان پر آگاہ ہیں۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ علامہ اقبال کی ہمہ گیر اور حکیمانہ شاعری کیلئے جہاں قرآن حکیم کے مطالب و معارف اور کامیاب ترین مضامین کے گہرے مطالعہ کے علاوہ مثنوی حضرت مولانا روم اور اس پایہ کی دوسری وجدانی کتابوں کی مسلسل رہنمائی نے تریاق کا کام کیا وہاں نہ صرف علامہ مرحوم کی شاعری کے رُخ کو پلٹنے بلکہ خود ان کی زندگی میں ایک خوشگوار تغیر اور ان کے مذہبی عقائد میں جزم و پختگی پیدا کرنے میں حضرت محترم مولانا انور شاہ کا بہت کچھ حصہ ہے۔ علامہ اقبال نے بہت سے موقعوں پر مولانا انور شاہ صاحب سے استفادہ کیا اور مذہبی معاملات میں ان کی رائے کے آگے سر تسلیم خم کرنے میں مسرت محسوس کی ہے۔ یہ علامہ اقبال کی زندگی کا ایک مستقل باب ہے اور افسوس ہے کہ بہت زیادہ محتاج تعارف تاریخ کے اس عظیم الشان شاعر اور ملت اسلامیہ کے اس بلند پایہ رہنما کے متعلق جرائد و رسائل کے سینکڑوں مضامین کے علاوہ اب مستقل کتابیں لکھی جاچکی ہیں، ان کی زندگی کا کوئی گوشہ ایسا نہیں جو تحقیق و تفصیل کے ساتھ

اشاعت کی روشنی میں نہ آگیا ہو۔ پھر پاکستان کے حساس اور اہل قلم نوجوان نے تو اپنے اس قومی شاعر کے کلام اور تاریخ حیات کی اشاعت کے لئے جس اولوالعزمی اور جوش عمل کا ثبوت دیا ہے وہ ہماری توقعات کے عین مطابق اور اُن کی حساس زندگی کے قیمتی احساسات کی آئینہ دار ہے، لیکن دو چار حضرات کے سوا علامہ اقبال کے متعلق اس قدر زیادہ لٹریچر میں انکی زندگی کے اس اہم اور مبارک سانحہ کے متعلق کسی نے ایک حرف لکھنا بھی گوارہ نہیں کیا، یہ ہماری خوش قسمتی ہے کہ ہمیں اپنے اس مختصر مضمون میں ان دونوں بزرگوں کے ان تعلقات اور تعلقات کے نتائج پر روشنی ڈالنے کا موقع مل رہا ہے ؂

آسماں بار امانت نتوانست کشید
قرعۂ فال بنام من دیوانہ زدند

تعلقات کی ابتدا

کم و بیش پچاس سال پہلے کی بات ہے کہ حضرت مولانا سید محمد انور شاہ صاحب رح اپنی مجلس علمی کے بہت سے ارکان جن میں مولانا حبیب الرحمٰن عثمانی مرحوم، مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی مدظلہٗ کے اسماء گرامی خاص طور پر قابل ذکر ہیں، معیت میں مولانا احمد علی صاحب شیرانوالہ دروازہ لاہور کی مشہور دینی انجمن خدام الدین کے سالانہ جلسہ میں شرکت کے لئے لاہور تشریف لے گئے تھے، انہی دنوں حضرت علامہ کشمیری کے ایک شاگرد مولانا حبیب الرحمٰن صاحب ملی جو ایک ذہین اور خوش فہم عالم ہیں علامہ اقبال کے کلام سے طبعی مناسبت رکھنے اور ان کے کمالات کے فراخ حوصلے قدرداں ہونے کی حیثیت سے خود ان کے دولت کدہ پر جا کر ملے تھے، علامہ اقبال اس سے پہلے مذہب کے

برکات وفضائل کے قائل اور مذہبی روایات کے عاشق ہونے کے باوجود عصر حاضر کے علمار سے کوئی اچھا گمان نہیں رکھتے تھے اور یہی وجہ ہے کہ اس وقت تک علامہ کے کلام میں مذہبی سوز وگداز نہ تو درجۂ کمال تک پہنچا تھا اور نہ ہی ان کی شاعری مذہبی طبقوں پر خاطر خواہ اثر ڈال سکی تھی۔ مولانا حبیب الرحمٰن صاحب موصوف سے مختلف مذہبی مسائل پر آپ نے تبادلۂ خیالات فرمایا اور اختتام گفتگو پر ان کی مذہبی آرار پر بہت حد تک اظہار اطمینان کیا خود مولانا حبیب الرحمٰن صاحب نے ایک دفعہ مجھ سے یہ واقعہ بیان فرمایا تھا وہ کہتے تھے کہ میں نے اخیر میں علامہ سے گذارش کی اگر آپ میرے استاذ مولانا انور شاہ صاحب سے ملاقات فرمائیں تو انشار اللہ وہ آپ کے تشکوک کا بہت مناسب طریق پر ازالہ فرمائیں گے۔ علامہ اقبال نے فرمایا کہ مجھے شاہ صاحب سے غائبانہ تعارف ہے اور میں کل ہی انھیں اپنے یہاں بلانے کا انتظام کروں گا۔

دوسرے دن حضرت شاہ صاحبؒ علامہ اقبال کی دعوت پر ان کی کوٹھی پر گئے اور کئی گھنٹہ تک آپ الہیات اور دوسرے دقیق علمی مسائل پر آپس میں گفتگو کرتے رہے، یہ ان تعلقات کی ابتدا ہے جو اس دور کے دو حکمار کے درمیان اخیر زندگی تک بہت مضبوط طریقہ پر قائم رہے، اور جنھوں نے ایک دوسرے کی علمی وعملی زندگی پر بہت مناسب اثر ڈالا۔

علامہ اقبال پھر رفتہ رفتہ حضرت شاہ صاحب سے بہت مانوس اور ان کے بے پناہ علم وفضل کی دل افروز دقیقہ سنجیوں اور دلکشا نکتہ سرائیوں کے بے حد معترف ہوگئے تھے۔

مدراس میں علامہ اقبال نے ایک دفعہ چند خطبات دیئے تھے، جو انگریزی زبان میں مستقل کتابی صورت میں چھپ کر دور دور تک پہنچ چکے ہیں، ان خطبات کے مذہبی حصہ کے لئے علامہ اقبال نے حضرت شاہ صاحب سے

مدد مانگی اور انہی خیالات کو حجت کے طور پر پیش کیا، جو حضرت شاہ صاحب نے ظاہر فرمائے تھے، خود علامہ اقبال نے اپنے اس استفادہ کا انہی خطبات میں برملا اعتراف کیا ہے۔

لاہور بلانے کی کوشش

۱۳۴۵ھ میں جب حضرت علامہ انور شاہ بعض اختلافات کی بنا پر دار العلوم دیوبند کی صدارت عظمیٰ سے مستعفی ہو کر ہمیشہ ہمیشہ کے لئے گوشہ نشینی کا ارادہ فرما چکے تو علامہ اقبال نے انھیں لاہور بلانے اور لاہور کو ان کے درس قرآن و حدیث کی نعمتوں سے مالامال کرنے کی بہت کوشش کی، ادھر لاہور میں آپ نے علامہ انور شاہ کے شایانِ شان ان کے قیام کے انتظامات کیے اور ادھر دیوبند آپ علامہ کشمیری سے خط و کتابت کرتے رہے، انھیں دنوں آپ نے مولوی سعید احمد مدیر برہان دہلی سے مزاح و ظرافت کے اپنے مخصوص انداز میں فرمایا تھا کہ دار العلوم دیوبند سے اختلاف رہنے میں ہمارا یہ فائدہ ہے کہ ہم حضرت شاہ صاحب کو لاہور لا سکتے ہیں اس لئے بعض وقت تو یہی جی چاہتا ہے کہ علامہ انور شاہ کا یہ اختلاف باقی رہے (بحوالہ مہاجر مرحوم دیوبند سالگرہ نمبر) جہاں تک یاد پڑتا ہے حضرت علامہ انور شاہ کے لاہور جانے کی یہ تحریک بہت حد تک کامیاب ہو چکی تھی اور لاہور کے ارباب عزت و اقتدار کے سامنے صرف حضرت شاہ صاحب کی وجہ سے ایک معیاری مذہبی یونیورسٹی کے قیام کی تجویزیں زیر غور و زیر عمل تھیں مگر یکایک علاقہ بمبئی کے ایک ذرا سے گاؤں ڈابھیل کی قسمت کا ستارہ چمکا اور حضرت شاہ صاحب کثیر التعداد طلبائے علومِ الٰہی کے ساتھ ڈابھیل تشریف لے گئے۔

ان تعلقات کے نتائج

ان تعلقات کا سب سے زیادہ مفید نتیجہ تو یہ پیدا ہوا کہ ڈاکٹر اقبال قادیانیت کے فتنۂ عظیم کے مفاسد و مکائد سے مطلع اور ان کی بیخ کنی کے لئے عملاً آمادہ ہو گئے، حضرت علامہ انور شاہ اس فتنہ کے تردید وابطال کو اپنی زندگی کا مشن اور اپنا ایک عظیم و کبیر فرض سمجھتے تھے انھوں نے ڈاکٹر اقبال کو بھی اسی رنگ میں رنگا اور پھر اقبال مرحوم نے اپنی تحریر و تقریر اور اپنی صحبتوں میں اپنے حکیمانہ انداز میں اس فتنہ کی چھپی ہوئی برائیوں کو یوں بے نقاب کرنا شروع کر دیا کہ "بہشتی مقبرہ" میں دبی ہوئی مرزا غلام احمد کی بوسیدہ ہڈیاں بھی چیخ اٹھیں۔ یہ علامہ انور شاہ ہی کا فیض نظر تھا جو "نبوت" کے سلسلہ میں ڈاکٹر اقبال کو یہ افکار عمیق، یہ لذت گفتار اور انداز بیان کی یہ پھبن نصیب ہوئی "ضرب کلیم" میں فرماتے ہیں ؎

میں نہ عارف نہ مجدد نہ محدث نہ فقیہ
مجھ کو معلوم نہیں کیا ہے نبوت کا مقام
ہاں مگر عالم اسلام پہ رکھتا ہوں نظر
فاش ہے مجھ پہ ضمیر فلک نیلی فام
عصر حاضر کی شب تار میں دیکھی میں نے
یہ حقیقت کہ ہے روشن صفت ماہ تمام
وہ نبوت ہے مسلماں کے لئے برگ حشیش
جس نبوت میں نہیں قوت و شوکت کا پیام

آج سے چار پانچ سال پہلے ہندوستان کی اسلامی دنیا مذہبی حساس اور سیاسی شعور کی جس منزل پر کھڑی تھی اب وہ اس سے بہت دور ہے

جو حضرات ایک زمانہ میں قادیانیت کی تردید کے لئے بیش قیمت خدمات انجام دے رہے تھے، اب انھیں بھی سیاسی ہنگامہ آرائیوں سے فرصت نہیں، مگر حضرت علامہ انور شاہ اور علامہ اقبال اس سلسلہ میں جو کام کر گئے ہیں وہ اپنی جگہ بہت قابل قدر اور ناقابل فراموش ہیں۔

قادیانیت کے ان جھگڑوں سے قطع نظر، علامہ کشمیری کی روحانی طاقت نے اقبال مرحوم کی ساری زندگی کو شراب الست کی مستی، مجاہدانہ حرارت اور ایک سوز دروں سے معمور کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ جن لوگوں نے اقبال مرحوم کے سارے کلام کا گہری نظر سے مطالعہ کیا ہے وہ مانتے ہیں کہ اقبال کے دل میں ابتدا سے اسلام کی لگن اور ان کی شاعری میں شروع سے زندگی کے دریا میں کود دیے ہوئے مسلمان کے لئے نہنگ و طوفان کے خوف اور تلاطم و تموج کے ڈر سے بے پروا ہو جانے کا حیات افروز پیام تھا، مگر خود ان کی خاک میں چھپے ہوئے شرارہ کو جس شخص نے علم و عمل کی پھونکوں سے بھڑکایا، ان کی نگہ بصیرت کو شوخی نظارہ اور ان کے فلک رس تخیل کو عرش پیما پرواز کی قوت دی وہ حضرت علامہ انور شاہ ہیں، اقبال مرحوم کی فارسی تصانیف کو جانے دیجئے کہ انھوں نے عام ہندوستانیوں میں زیادہ مقبولیت نہیں پائی مگر یہ "بانگ درا"، "بال جبریل" اور "ضرب کلیم" تو آپ کے سامنے ہیں انھیں دیکھ کر فیصلہ کر لیجئے کہ اقبال کے کمالات شاعری میں درجہ بدرجہ کس قدر حیرت انگیز اضافہ ہوتا گیا ہے۔

بانگ درا میں وہ ایک کامیاب شاعر اور کسی حد تک قومی اور مذہبی رہنما ہیں۔ پھر بال جبریل میں ان کی حیثیت پہلے سے کہیں بلند ان کا انداز خالص الہامی ان کی آواز صرف حجازی اور ان کی حکمت و قابلیت شباب کے راستہ پر آگئے ہیں، اور "ضرب کلیم" نام ہے ان کے ان سارے کمالات کی حیران کن معراج کا۔

پُرانے صحافی اور اہل قلم

ہمیں نہ چھیڑ کہ ہم ہیں چراغ آخرِ شب
ہمارے بعد اندھیرا نہیں اُجالا ہے

ہندو پاکستان سے اردو کے وہ صحافی، اہل قلم اور باکمال مصنفین تقریباً سب ہی اٹھ گئے جنھوں نے اپنے خونِ جگر سے اردو ادب و صحافت کے باغ کو سینچا تھا۔ یہ پوری نسل نفسِ گرم، عملِ پیہم اور یقین محکم کی حامل تھی سب نے بڑی محنت و مشقت اور ایثار و جفاکشی کے ساتھ اپنے مشن کو آگے بڑھایا اس صف کے بہت کم حضرات اب ہندوستان میں باقی رہ گئے ہیں جن کے مختصر تذکرہ سے میں آج کی نشست کو لطف اندوز کرنا چاہتا ہوں۔

مولانا محمد عثمان فارقلیط

اردو کی معیاری صحافت کا ذکر آئے گا تو مولانا فارقلیط کا نام آنا ضروری ہے ۸۲ سال کی عمر، بہت نحیف جثہ، پوشاک بہت سادہ، زندگی آرام و تعیش سے یکسر خالی مگر دلِ بادشاہوں کا اور دماغ وزیروں کا، کتابوں ترجموں اور مضامین اور مقالات اور ناولوں کی شکل میں خبر نہیں کتنے ہزار صفحات مولانا نے لکھ دیے ہوں گے، ان کی صحافتی زندگی کا آغاز کراچی کے اخبار "الوحید" سے ہوا، پھر الجمعیۃ، زمزم لاہور اور مدینہ بجنور میں ان کا قلم ملک و قوم کی تربیت کے لئے مسلسل مصروف عمل رہا۔ اب بقول خود وہ شام زندگی میں داخل ہو گئے ہیں مگر ان کا ذہن بیدار اور قلم رواں دواں ہے پوری زندگی ایثار و بے غرضی کا ایک نمونہ ہے، نہ کبھی بادشاہوں کے جلال و

جبروت سے ڈرے اور نہ کبھی کسی غرض اور لالچ سے اُن کے قلم نے ادنیٰ درجے کی کوئی خیانت کی۔ بلیماران دہلی کے احاطہ کالے صاحب کے ایک مختصر مکان میں علم و ادب کی یہ شمع اب بھی روشنی بکھیر رہی ہے، ان کے مقام علم وفضل کو سمجھنے والے ان کے راستے میں آنکھیں بچھاتے ہیں۔

سردار دیوان سنگھ مفتون

دہلی کے مشہور اور معیاری اخبار "ریاست" کے کامیاب ایڈیٹر، تقریباً ۶۰ سال تک بھوپال، بڑودہ، پٹیالہ، حیدرآباد، جے پور کی ریاستیں، ان کے زورِ قلم، صاف بیانی اور بیباک لب ولہجہ سے لرزہ براندام رہیں۔

کتنے مقدمے اور کتنی سازشیں سردار دیوان سنگھ مفتون کے خلاف کی گئیں، مگر دیوان سنگھ کے حوصلے اور ہمت پر کوئی اثر نہیں پڑا، اور یہ مردِ باہمت ہر مشکل اور ہر مصیبت سے گذرتا آگے بڑھتا رہا۔ دیوان سنگھ نے اپنی زندگی میں لاکھوں کمائے، لاکھوں اڑائے، روپیہ پیسہ اس کے ہاتھوں کا میل رہا، یاروں کا یار، دشمنوں کا دشمن، دل کا صاف اور ہمت کا مضبوط۔ اب اخباری زندگی سے ریٹائر ہو کر تقریباً سولہ سترہ برس سے دہرہ دون کے پاس ایک قصبہ راجپور میں مقیم ہیںؔ، ۸۶ برس کی عمر اور انتہائی ضعف وکمزوری کا وقت ہے، اس دور میں انھوں نے "ناقابلِ فراموش" اور "جذباتِ مشرق" جیسی بلند پایہ کتابیں اردو کو عنایت کی ہیں "سیف وقلم" کے نام سے ایک کتاب عنقریب سامنے آنے والی ہے سردار دیوان سنگھ سادہ اردو لکھتے ہیں مگر ان کے ہر لفظ میں فکر و نظر کی گہرائی، تجربہ، دلچسپی اور ان کا اپنا اندازِ فکر ہوتا ہے، ان کی کتاب "ناقابلِ فراموش" اتنی دلچسپ اور اثر انگیز کتاب ہے کہ کوئی بھی پڑھا لکھا شخص اسے شروع کر کے ختم کئے بغیر نہیں رہ سکتا، وہ اردو صحافت

ؔ پچھلے دنوں دہلی میں سردار صاحب کا انتقال ہو گیا۔

کی ایک زندہ یادگار ہیں، جن کی بہادری، حق گوئی اور استقامت کی تاریخ پر ہم فخر کر سکتے ہیں اور کرتے ہیں۔

مہاشہ خوشحال چند خورسند

شری رنبیر ایڈیٹر روزنامہ "ملاپ" دہلی کے والد بزرگوار لاہور کے صحافتی معرکوں کے مرد میدان مولانا ظفر علی خاں اور سالک و مہر کے ہم عصر بڑی اچھی اور صاف ستھری اردو لکھتے تھے، ان کی اخبار نویسی ایک مقصدی اخبار نویسی تھی۔

تقسیم سے پہلے لاہور میں جہاں "زمیندار"، انقلاب، احسان، شہباز، شیر پنجاب روزانہ پرتاپ اخبار پارس گرو گھنٹال ویر بھارت اردو صحافت کے نمائندہ اخبارات تھے وہیں لالہ خوشحال چند خورسند کا اخبار ملاپ بھی اپنی جگہ ایک مقام رکھتا تھا۔ لالہ جی اپنے اصول کے پکے اور بات کے دھنی تھے دار و رسن کا کوئی خوف اور مخالفت و نبرد آزمائی کا کوئی اندیشہ ان کے قلم کو اپنی جگہ سے نہیں سرکا سکتا تھا، افسوس کہ اردو صحافت لالہ خوشحال چند کی خدمات سے ان کے جیتے جی محروم ہو گئی، لالہ جی نے اپنا اخبار اور سارا کاروبار اپنے لائق بیٹے رنبیر جی کے سپرد کر کے خود سنیاس لے لیا اور اب وہ مہاتما آنند سوامی سرسوتی کے نام سے ریاضت و تپسیا کی زندگی گذار رہے ہیں۔ کاش وہ کچھ دن کے لئے اپنی جگہ لوٹ آئیں اور موجودہ نسل ان کی شاندار صحافت، ہمہ گیر اور مضبوط طرز تحریر سے آشنا ہو سکے مہاشہ جی کا سنہ پیدائش ۱۸۸۲ء اور جنم بھومی پاکستان کا ایک قصبہ جلال پور جٹاں ہے، سنہ ۱۹۰۸ء میں آپ نے لاہور کے اخبار "آریہ گزٹ" سے صحافتی زندگی شروع کی، سنہ ۱۹۲۳ء سے ملاپ جاری کیا، یہ اخبار اردو کے بڑے اخبارات میں سے ہے اور اب شری رنبیر کی ادارت

اور انتظام میں بیک وقت لندن، جالندھر، حیدرآباد اور دہلی سے شائع ہوتا ہے۔ مہاشہ جی سنیاس لینے کے بعد مذہبی کاموں میں لگے ہوئے ہیں ۱۹۶۹ء میں آپ کی زندگی نے یہ موڑ لیا ہے، اس وقت سے اب تک آپ مذہبی مشن پر تبت، برما، تھائی لینڈ، ملیشیا، سنگاپور، آسٹریلیا، نیوزی لینڈ، ہانگ کانگ، جاپان، اٹلی، فرانس، جرمن، برطانیہ، آئرلینڈ امریکہ، جنوبی امریکہ، ماریشش، یوگینڈا، تنزانیہ، کینیا وغیرہ کا دورہ کرچکے ہیں، مہاشہ خوشحال چند خورسند کی زندگی کا شاندار پہلو یہ ہے کہ انھیں اللہ تعالیٰ نے رنبیر جیسا فرزند دیا ہے جو صاف دماغی اور بہادری اور ثابت قدمی کے ساتھ صحافت میں ان کے کام اور نام کو زندہ کیے ہوئے ہیں، مہاشہ رنبیر ایک نامور مصنف، مجاہد وطن اور بیباک اخبار نویس ہیں متعدد موضوعات پر ان کی بلند پایہ کتابیں ہیں۔ رنبیر جی انگریزوں کے خلاف مقدمہ سازش لاہور کے ماخوذین میں سے ہیں اور جنگ آزادی میں ان کی قربانیوں کی ایک بڑی داستان ہے۔

مولانا حامد الانصاری غازی

بڑے باپ اور بڑے گھرانہ کے فرزند ہیں، مولانا محمد قاسم نانوتوی ان کے ددھیال اور مولانا خلیل احمد سہارنپوری ان کے ننھیال کے بزرگ ہیں، مولانا عبداللہ انصاری ناظم اول شعبۂ دینیات علی گڈھ ان کے دادا اور مشہور مجاہد وطن مولانا منصور انصاری ان کے والد ہیں، جن لوگوں نے مولانا ابوالکلام آزاد کی خطیبانہ تحریر اور مولانا ظفر علی خاں کی پرشکوہ اردو سے متاثر ہو کر انھی کا لب و لہجہ اختیار کیا ان میں غازی صاحب کا نام سرفہرست ہے، لیکن انھوں نے بہت جلد اپنا ایک انداز نگارش پیدا کرلیا جس میں میر کا سوز و گداز، مولانا ابوالکلام اور ظفر علی خاں کا شکوہ خسروانہ

جگر کی غزل کا مٹھاس اور غلام رسول مہر کے مقالات کا استدلال تھا، غازی صاحب دیوبند کے فیضان علم کے پروردہ ہیں، حضرت علامہ سید انور شاہ کشمیری کی مجلس علمی کے حاضر باش ہیں، قرآن و حدیث، تاریخ اور سیاست پر ان کی گہری نظر ہے، اخبار "مہاجر" دیوبند، مولانا تاجور نجیب آبادی کے اخبار "نقاد" بجنور کے "مدینہ" "الجمعیۃ" اور "جمہوریت" بمبئی میں ایک پوری نسل ان کے عالمانہ مضامین سے متاثر رہی ہے، غازی صاحب سیاسی ذہن رکھتے ہیں، پوری دنیا کی سیاست پر ان کی نظر رہتی ہے اور سیاسی نشیب و فراز کو خوب سمجھتے ہیں، اپنی نسل کے دوسرے ممتاز افراد کی طرح وہ وسائل زندگی سے بے نیاز رہے ہیں، فکر معاش سے بڑی حد تک بے فکر آمدنی سے زیادہ خرچ، اپنے بڑوں کو ہر موقعہ پر یاد رکھتے اور چھوٹوں پر حد سے زیادہ شفیق، ۷۰ سے زائد عمر ہے مگر اب بھی پھدکتے پھرتے ہیں۔ بمبئی ان کا گھر ہے اور دیوبند ان کے گھر کا آنگن، عملی زندگی کی ذمہ داریوں سے کوسوں دور جا پڑے ہیں۔

بڑا اچھا ہوا کہ غازی صاحب نے لکھنا بڑی حد تک ترک کر دیا ورنہ ان کی موجودگی میں اس وقت کے بہت سے اہل قلم کلبلا کر رہ جاتے اور کچھ نہ لکھ سکتے۔

مفتی شوکت علی فہمی

سن رسیدہ، کہنہ مشق اور با اصول صحافی اور ممتاز مصنف ہیں، میرٹھ کے مفتیوں کے معزز خاندان سے ان کا نسلی تعلق ہے اور ان کا خاندان ۱۸۵۷ء کے ہنگامہ کا میرٹھ میں بانی رہا ہے، والد کا نام مفتی برکت علی صاحب اور نانا کا نام مولوی ہاشم علی صاحب ہے، مولوی ہاشم علی صاحب وہ بزرگ ہیں جن کا مطبع ہاشمی اپنے وقت میں علمی کتابوں کی طباعت و اشاعت کا بڑا

مرکز تھا، اس مرکز کے مصحح حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی تھے، حضرت مرحوم مہینہ میں دس بارہ روز میرٹھ میں رہ کر مطبع کے علمی کاموں کی نگرانی کرتے تھے فہمی صاحب کی ولادت ۱۹۰۴ء کی ہے، ۱۹۲۳ء سے پہلے ہی فہمی صاحب تحریر و صحافت کے میدان میں آگئے تھے، ۱۹۲۳ء میں دہلی سے دین دنیا پھر روزنامہ عادل، سہ روزہ عادل، ہفتہ وار طاقت، ماہنامہ اسلامی دنیا ماہنامہ سیاسی دنیا نکالتے رہے۔ فہمی صاحب شمس العلماء خواجہ حسن نظامی کے حلقہ کے آدمی ہیں، تحریر و صحافت میں مولانا محمد حسین آزاد اور خواجہ صاحب سے متاثر ہیں، اب ۷۰ سال سے متجاوز عمر ہے مگر کام ان کی زندگی کا سب سے بڑا مقصد اور بیکاری انھیں سب سے زیادہ ناپسندیدہ ہے، اب بھی بارہ اور چودہ گھنٹے یومیہ کام کرنا ان کا معمول ہے، ان کی تصنیفی اور مقالاتی زبان بہت صاف ہے، جہاں تاریخ پر گہری نظر رکھتے ہیں وہاں روزانہ کے معاملات اور سیاسی اتار چڑھاؤ کو بھی خوب پہچانتے ہیں، اینچ پینچ کے بغیر بات کرنے کے عادی ہیں، تحریر میں سادگی کے ساتھ استدلال کا زور، ترتیب بیان کا حسن اور فہمی صاحب کی اپنی اولوالعزمی کی ایک شان ہوتی ہے، تقسیم کے بعد تاریخ پر بیسیوں کتابیں ان کے قلم سے نکلیں، جو سب علمی اور عوامی حلقوں میں مقبول ہیں بار بار چھپی ہیں اور ہاتھوں ہاتھ بک جاتی ہیں۔

فہمی صاحب اصول پسندی، وضعداری، شرافت، سچائی اور اپنے نظریات پر بھرپور استقامت کی ایک قابل فخر مثال ہیں، نئے لکھنے والے اس دور میں ایسے مواقع پر کہتے ہیں کہ اس نے قلم کی آبرو کو فروخت نہیں کیا مجھے یہ جملہ اپنے الفاظ کے دروبست میں حسین نہیں معلوم ہوتا، میں فہمی کے متعلق کہوں گا کہ انھوں نے قلم کی عزت کو باقی رکھا، قلم کو اپنی شہرت اور معاش کا ذریعہ نہیں بنایا، یہ دوسری بات ہے کہ وہ بے ارادہ انھیں انکے قلم سے عزت بھی ملی اور خوش حال زندگی بھی۔ فہمی صاحب بہرحال اپنے

قلم کو قوم اور ملت کی امانت سمجھتے ہوئے اور ہزاروں صفحات لکھ دینے کے باوجود مقصد سے ہٹ کر کچھ لکھنے پر تیار نہیں۔

گوپی ناتھ امن لکھنوی

یہ ہندو مسلمان کی مشترکہ تہذیب کی آخری نشانیوں میں سے ہیں، وہ تہذیب جس میں اپنے مذہب کی پابندی کے ساتھ دوسرے مذاہب کی عزت اور دوسرے اہل مذہب کے ساتھ شرافت کا معاملہ ایک بنیادی عنصر کی حیثیت رکھتا تھا، لکھنؤ وطن ہے مگر صحافتی اور سیاسی زندگی کا بڑا حصہ دہلی میں گذرا ہے، عملی سیاست کی بھول بھلیوں میں بھی عرصہ تک گھومتے رہے ہیں ؎

ہوں اس کوچہ کے ہر ذرہ سے آگاہ
ادھر سے مدتوں آیا گیا ہوں

سالہا سال تک اخبار "تیج" کی کرسی ادارت سے انھوں نے پریم اور آشتی کا پیغام دیا پھر اپنا ایک روزنامہ "نیا سنسار" بھی نکالا، اردو کے پختہ کار ادیب اور گفتار شاعر ہیں، منجھی ہوئی نثر اور شگفتہ شعر کہنے پر قادر ہیں، مولانا حفظ الرحمٰن کے جنازہ میں دور سے انھیں دیکھنے کا اتفاق ہوا تو کسی وقت حکومت دہلی کے وزیر اور اس وقت بھی کسی بڑے سیاسی عہدہ پر مامور ہونے کے باوجود نہایت سادہ انسان نظر آئے۔

انیس احمد عباسی

جناب انیس احمد عباسی ہماری بزم صحافت کی ایک نمائندہ شخصیت ہیں، غالباً مشہور اخبار نویس سید جالب مرحوم ایڈیٹر روزنامہ "ہمدم" لکھنؤ کے شاگرد ہیں اور اپنا روزنامہ اخبار "حقیقت" لکھنؤ سے نکالتے ہیں

افسوس ہے کہ کافی کوشش کے باوجود مجھے ان کے حالات دستیاب نہیں ہو سکے۔

ان حضرات کے علاوہ مہاشہ نانک چند ناز، شری شیو نرائن بھٹناگر ایڈیٹر روزنامہ "وطن" دہلی، شری رام لال ورما ایڈیٹر "تیج" جناب جمنا داس اختر ایڈیٹر روزنامہ "سویرا" گوری شنکر ساگر، جناب معین الدین حارث (جامعہ) خان غازی کابلی، محمد سلیمان صابر اور جناب ناز انصاری سہارنپوری اور جناب حیات اللہ انصاری وغیرہ اردو کے پرانے اخبار نویس ہیں۔ اور ان کی تحریروں سے ملک نے بڑا فائدہ اٹھایا ہے۔

میں کوشش کروں گا کہ آئندہ کسی فرصت میں ان حضرات کے حالات پر مختصر طریقہ پر بیان کروں۔

بقیہ منشی مہدی حسن مرحوم (صہ ۱۳۳ سے آگے)

کے لوگ صرف دو چار رہ گئے ہیں، نمبردار محمد منعم صاحب حکیم محمد منعم صاحب، حضرت مولانا محمد طیب صاحب، اللہ تعالیٰ ان کی عمر دراز فرمائے، منشی جی کی ذات ایسی نہیں تھی کہ دیوبند والے انھیں جلد بھول جائیں، وہ موقع بموقع اپنی قابلیت بزرگانہ شفقت، اپنی اصابت رائے اور اپنی زندگی کی ایثار پسندی کے لئے بہت یاد آئیں گے۔

منشی مہدی حسن مرحوم

آج کل کے نئے ادیب اکثر کہتے ہیں کہ فلاں آدمی عمر بھر اپنی زندگی سے لڑتا رہا، بعض ایسے اشخاص کے لئے جنھیں طویل مرض الموت کا سامنا کرنا پڑتا ہے کہتے ہیں کہ وہ مردانہ وار موت سے لڑتا رہا، مجھے یہ طریقۂ تعبیر پسند نہیں، انسان کی زندگی سے کیا لڑائی اور کیا موت سے زور آزمائی۔

مگر منشی مہدی حسن صاحب کی زندگی اور موت نے واقعی مجھے بتایا کہ اس طرح زندگی سے لڑتے اور اس طرح موت کا سامنا کرتے ہیں، مرحوم سے میرا تعلق چالیس سال پہلے کا ہے، اس زمانہ میں منشی جی خلافت اور تحریک شیخ الہند کے کاموں سے نمٹ کر اپنی ایک پریس چلاتے تھے، منشی جی کا مکان میرے مکان سے ذرا ہی فاصلہ پر تھا، میرا بچپن تھا، اخباروں، رسالوں اور پریسوں سے دلچسپی تھی، کبھی کبھی منشی جی کی طرف جا نکلتا۔ جمیل مہدی کی عمر اس وقت پانچ چھ سال تھی اور عقیل نحرزن مرحوم ڈھائی تین سال کے تھے، منشی جی کی اہلیہ اپنی اور منشی جی کی عین جوانی میں انتقال کر گئی تھیں، منشی جی نے پھر شادی نہیں کی، ان دو بچوں ہی کو سینہ سے لگائے بیٹھے رہے اور پرورش بھی اس شان، اس لاڈ پیار اور محبت سے کی کہ دو چار مائیں بھی ہوتیں تو وہ بھی ایسی محنت نہ کر پاتیں، ایک بڑا عرصہ منشی جی کے گھر میں ایسا گذرا کہ گھر میں کوئی عورت نہیں تھی، کھانے پینے کا سارا نظم خود کرتے یا ان کے پاس آنے جانے والے ہاتھ بٹا دیتے۔ منشی جی نے کم و بیش ۳۱ سال تک زندگی کی یہ مشقتیں برداشت کیں مگر ان دو بچوں کی بے آرامی کے خیال سے نکاح ثانی

کا ارادہ نہیں کیا۔

منشی جی میری یادداشت سے پہلے خلافت اور حضرت شیخ الہندؒ کی تحریک سے براہ راست وابستہ تھے، ان قومی تحریکات ہی کے سلسلہ میں سرکاری ملازمت سے مستعفی ہوئے، کافی عرصہ تک قومی لٹریچر چھاپ کراسے ملک میں پھیلانے کی خدمت ان کے ذمہ رہی، اس زمانہ کے قومی رہنماؤں سے ان کا گہرا تعلق تھا، مشہور شعلہ ریز مقرر سید عطاء اللہ شاہ بخاری ایک تو ان قومی تحریکات کے تعلق اور ایک پنجاب کے مشہور پیر طریقت مہر علی شاہ صاحب گولڑہ والوں کی خانقاہی نسبت سے، دیوبند جب کبھی آتے منشی جی سے ضرور ملتے، ہمارے منشی جی اور سید عطاء اللہ شاہ بخاری دونوں پیر مہر علی صاحبؒ کے حلقۂ ارادت سے تعلق رکھتے تھے منشی جی نے قومی تحریکات سے یکسو ہو کر اپنا سارا وقت عدالتی کاموں میں بسر کیا۔

قانونی داؤں پیچ پر ان کی نظر اتنی گہری اور دور رس تھی کہ بڑے بڑے وکیل اور ایڈوکیٹ ان کے محتاج تھے، جس معاملہ میں منشی جی نے جو قانونی راستہ تجویز کر دیا وہ بس آخری راستہ تھا، اہل معاملہ نے اگر کوئی دوسرا راستہ اختیار کیا تو سالہاسال کچہریوں اور عدالتوں کے چکر لگانے کے بعد ناکامی کا منہ دیکھا۔

منشی جی کی یادداشت کا یہ عالم کہ دیوبند اور اس کے مضافات کی کل جائدادوں کی تفصیل انھیں ازبر تھی، یہ مکان اصلاً کس کا تھا، کب کس کے قبضہ میں گیا، کس نے بیچا، کس نے خریدا، یہ کھیت کتنے بیگہ کا ہے، اس باغ کی اصل ڈول اور حد کہاں تھی، یہ دوکان کب بنی تھی؟ ان سب چیزوں کے لئے انھیں نہ کسی مثل کے دیکھنے کی ضرورت تھی اور نہ پٹواری کے خسرہ اور نقشہ کے ساتھ جھک مارنا کوئی ضروری تھا، منشی جی سے دو منٹ بات کر دو اور سب کچھ پوچھ آؤ، منشی جی محنت سے کماتے مگر سخاوت کا یہ عالم کہ

صبح ناشتہ اور کھانہ پر ان کے دو چار دوست ان کے ساتھ ہوتے، یہ دوست نہ آتے تو منشی جی انھیں خود بلا کر لاتے اور کھانے میں شریک کرتے، مجھ سے تو ان کی محبت کا معاملہ ہی دوسرا تھا، جانتے تھے کہ مجھے پلاؤ سے رغبت ہے تو کبھی کبھی رستہ میں ملتے، بڑی شفقت سے کہتے کہ عبدالغنی کے یہاں سیلے کے پرانے چاول آئے ہوئے ہیں بس اب پلاؤ کھالو، میں ہامی بھر لیتا تو دوسرے ہی دن منشی جی پلاؤ کا دیگچہ تیار کر لیتے، پھر کھانے کے بعد چائے ہوتی اور گنگلے کے یہاں کی مٹھائی۔

ایثار نفس، قومی معاملات میں فرض شناسی، دینی کاموں میں دلچسپی انکی زندگی کا طرۂ امتیاز تھا۔ ہمارے شہر کے بڑے مشہور طبیب حکیم محمد عمر صاحب برسہا برس تک ایک مسجد کی تعمیر کے سلسلہ میں مقدمہ بازی میں پھنسے رہے جس کی ساری پیروی خود حکیم صاحب نے اپنی ذات اور اپنے پیسے سے کی، حکیم صاحب نے بارہا کہا کہ سالہا سال تک اس مقدمہ کے سلسلے میں بغیر کسی معاوضے کے ان کی قانونی کارروائی اور خطرناک سے خطرناک مراحل پر منشی جی ان سے تعاون کرتے رہے۔

حکیم صاحب کے الفاظ ہیں کہ دیوبند کی ہزاروں کی آبادی میں بس منشی مہدی حسن میرے ساتھی ہیں۔ ہمارے ہی شہر کے ایک عالم دین ایک دینی معاملہ میں ایک مقدمہ شروع کرنا چاہتے تھے، یہ مقدمہ منشی جی کی بیماری کے زمانہ میں ان کے پاس آیا اور دینی جذبہ سے منشی جی نے اس کی ذمہ داری قبول کر لی۔

افسوس ہے کہ مرض الموت کی پیچیدگیوں نے انھیں اس مقدمہ پر ہونے کا موقع نہیں دیا، اب انتقال سے کچھ پہلے مرحوم نے اپنے فرزند جمیل مہدی کے ذریعہ جہاں اور بہت سے لوگوں کی امانتوں کی چھوٹی چھوٹی رقمیں بڑی احتیاط کے ساتھ انھیں واپس کیں وہاں ان عالم دین کی ایک بڑی رقم جو انھوں نے مصارف مقدمہ کے لئے منشی جی کو دی تھی، انھیں پہنچا دی۔

امانت ودیانت کا یہ حال تھا کہ دوسروں کا معمولی سا قرض بھی یاد رکھتے اور اسے پوری ذمہ داری سے ادا کرتے، شہر بھر میں ایک آدمی بھی ایسا نہیں ملے گا جو منشی جی کو اپنا مقروض بتا سکے۔

جمیل مہدی اور عقیل مخزن مرحوم کو تو انھوں نے جس لاڈ و پیار کے ساتھ پالا وہ اپنی جگہ شفقت و محبت کی ایک مثال بن کر رہ گیا۔ اب عقیل مرحوم کے ۳ خورد سال بچے ہی منشی جی کی کل کائنات تھی، ان بچوں سے ان کی شیفتگی کا عالم ایک اور ہی عالم تھا، اب سے ڈیڑھ برس پہلے کی بات ہے میں مغرب کے بعد بازار سے اپنے محلہ کی طرف آرہا تھا تو دیکھا کہ سڑک کے کنارے لگے ہوئے بجلی کے کھمبے سے منشی جی زور آزمائی کر رہے ہیں، قریب میں عقیل کا ڈھائی تین سال کا بچہ کھڑا ہے، دیکھ کر تعجب ہوا کہ منشی جی کو کیا ہوا اور یہ کیا کر رہے ہیں۔ میں نے پوچھا کہ منشی جی یہ کیا؟ تو کھمبے سے ذرا ہٹ کر کھڑے ہو گئے، ہنسنے لگے اور کہنے لگے۔

یہ عقیل کا بچہ ضد کر رہا ہے کہ بجلی کے کھمبے کو اکھاڑ کر اپنے گھر لے چلو چنانچہ یہ کھمبا اکھیڑا جا رہا ہے۔"

میں نے کہا کہ "آپ بھی غضب کرتے ہیں، بچہ کا دھیان آپ نے دوسری طرف منتقل نہ کیا اور خواہ مخواہ کھمبے سے پہلوانی شروع کر دی۔"

پھر میں نے بچہ سے کہا آؤ میاں تمہیں مٹھائی کھلائیں اور بچہ کو گود میں لے کر قریب کے حلوائی کی دوکان سے مٹھائی لے کر بچہ کو دی، بچہ مٹھائی میں لگ گیا اور کھمبے کی ضد ختم ہو گئی۔

منشی جی خوش ہو گئے، کہنے لگے، شاہ صاحب اس وقت تو آپ کی تدبیر چل گئی۔

دیوبند میں ہماری برادری میں منشی جی اپنی شرافت، وقار، معاملاتی سوجھ بوجھ اور اپنی عمر کی زیادتی میں ایک نمونہ تھے اب برادری میں اتنی عمر کے

(باقی صہ ۱۲۹ پر ملاحظہ ہو)

حضرت مولانا حبیب الرحمٰن لُدھیانوی

متحدہ پنجاب کی تاریخ اس حقیقت کی گواہ ہے کہ حضرت مولانا حبیب الرحمن لدھیانوی کا تعلق لدھیانہ کے ایک ایسے خاندان سے تھا جو نسلوں اور پشتوں سے اپنے علم وفضل اور دین ودیانت، خدمت خلق، خدمت دین، مجاہدانہ سرفروشی اور عزیمت وبلند ہمتی میں ممتاز اور اپنی ان صفات کی وجہ سے مرجع انام تھا، ان کے آبا واجداد میں حضرت مولانا عبدالقادر صاحب، حضرت مولانا محمد صاحب مشہور بزرگ گذرے ہیں۔ یہ حضرات ہندوستان میں انگریزی سامراج کے ابتدائی مخالفوں میں سے تھے اور انھیں کی یہ خصوصیت تھی کہ مرزا قادیانی کے دعاوی باطلہ کا صحیح دینی روشنی میں ان بزرگوں نے تجزیہ فرمایا، اس کے فتنہ عظیم کا مقابلہ اور اسلام کے تقاضوں سے اس پر کفر کا فتویٰ نافذ فرمایا، انڈین نیشنل کانگریس میں مسلمانوں کی شرکت کے جواز پر بھی ۵۰۰ علمائے امت کا مشہور فتویٰ بھی انھیں حضرات نے مرتب اور شائع کیا تھا۔ یہ ۵۰۰ علمار کا فتویٰ ہندوستان کی سیاسی تاریخ کا ایک بہت بڑا واقعہ ہے، افسوس کہ فرقہ واریت کے شدید غلبہ نے اس کی اہمیت کے سمجھنے کا موقع نہیں دیا، یہ لوگ تو مولانا حبیب الرحمان کے آبار واجداد تھے، ان کے والد بزرگوار حضرت مولانا محمد زکریا صاحب ایک قلندر صفت رچے بسے ہوئے بزرگ پختہ عالم درویش صفت انسان، بزرگوں اور علمار کے ہمنشیں اور بڑے بڑے وزرار وحکامان وقت پر اپنے دینی دبدبہ کے ساتھ مؤثر تھے، مجھے اچھی طرح معلوم ہے کہ مولانا محمد زکریا صاحب جمعہ کے دن محلہ موچیورہ سے

اپنے گھر سے کمپنی باغ کی شاہی مسجد میں نماز جمعہ ادا کرنے کے تشریف لاتے تھے، تو راستے میں کئی بازاروں کے دوکاندار اس خوف سے اپنی دوکانیں بند کر لیتے تھے کہ مولانا ادھر سے گذریں گے اگر نماز جمعہ کے قریب وقت میں ہماری دوکانیں کھلی ہوئی پائیں گے تو خفا ہوں گے۔ حضرت مولانا مرحوم حضرت شیخ الہند، مولانا حافظ احمد صاحب مہتمم دارالعلوم دیوبند، مولانا حبیب الرحمٰن عثمانی، حضرت مولانا سید محمد انور شاہ کشمیری مولانا شبیر احمد عثمانی، مولانا احمد علی لاہوری، مولانا عبدالقادر لاہوری، سید عطاء اللہ شاہ بخاری اور ان کے شیخ طریقت پیر مہر علی شاہ گولڑہ والے مولانا نور احمد صاحب پسروری، رئیس الاحرار مولانا حسرت موہانی، مولانا محمد علی جوہر، مولانا شوکت علی، مولانا ظفر علی خاں، ڈاکٹر سر محمد اقبال حضرت مفتی کفایت اللہ، مولانا احمد سعید، مولانا حفظ الرحمٰن اور دوسرے سینکڑوں علماء اور فضلاء ان کے یا ہمعصر تھے یا ان کے بزرگ اور پیش رو، اور یہ پورا طبقہ ان کا ادب واحترام کرتا تھا۔

مولانا حبیب الرحمٰن کی زندگی میں ان کا خاندان مولانا عبدالرشید مرحوم، عبدالحمید صاحب مرحوم، مفتی ضیاء الحسن صاحب لدھیانوی، مفتی عبدالحمید اور دوسرے بیسیوں حضرات ان کے ہمعصر تھے یا ان کے چھوٹے علم وفضل کے اس لہلہاتے باغ میں مولانا حبیب الرحمٰنؒ ایک سدا بہار پھول کی طرح آنکھ کھولی، ابتدائی تعلیم گھر پر حاصل ہوئی اور پھر ابتدائی عمر میں مرکز علمی دارالعلوم میں تشریف لے آئے، یہاں انھیں مولانا حبیب الرحمٰن عثمانی کی تربیت اور حضرت علامہ سید محمد انور شاہ کشمیری کا فیضان التفات حاصل رہا۔ ممتاز اساتذۂ وقت کی رہنمائی میں تعلیم کا سلسلہ جاری رکھا اور بڑی محنت کے ساتھ دینی علوم حاصل کئے۔

۱۹۱۲ء میں تحریک خلافت میں مولانا پہلی مرتبہ گرفتار ہوئے یہیں سے

ان کی مجاہدانہ دینی وسیاسی زندگی کا آغاز ہوا۔ ۱۹۱۹ء سے ۱۹۶۰ء تک کم و بیش چالیس سال نہ صرف متحدہ پنجاب بلکہ پورا ہندوستان ان کے نفس گرم تگ ودوئے پیہم، یقین محکم، اخلاص کامل، خدمت خلق اور شعلہ بار تقریروں سے گونجتا رہا، وہ تحریک خلافت کے جانباز سپاہی، کانگریس کے سرگرم کارکن، مجلس احرار کے روح رواں، اسلامی مدارس کے مشیر اور خیر خواہ، اپنے نصب العین کے وفادار، اپنے ساتھیوں کے غمگسار تھے۔ ۱۹۳۰ء کے کراچی کانگریس میں وہ نمایاں تھے، ۱۹۳۱ء میں جب گاندھی جی گول میز کانفرنس میں شرکت کے لئے لندن جارہے تھے تو مولانا مرحوم، سید عطاء اللہ شاہ بخاری اور چودھری افضل حق کے ساتھ بمبئی کے ساحل پر گاندھی کو الوداع کہہ رہے تھے۔

تحریک کشمیر نے ان کے دم سے جنم لیا، انگریزی زمانہ کی ریاستوں میں عوام کو حق خوداختیاری دلوانے کے سلسلے میں مولانا کی بڑی خدمات ہیں۔ اپنے استاذ حضرت مولانا سید محمد انور شاہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ کی رہنمائی اور ڈاکٹر سر محمد اقبال کے تعاون سے انھوں نے قادیانی تحریک کے استیصال کے سلسلے میں ہمہ گیر جدوجہد فرمائی۔ تبلیغ اسلام کا کوئی گوشہ ایسا نہیں تھا جس پر مولانا نے کوئی توجہ نہ فرمائی ہو۔

مولانا کی جامع شخصیت

مولانا حبیب الرحمٰن کی بڑی شخصیت یہ تھی کہ اللہ کریم نے علم وفضل اخلاق، اعمال، تہذیب وسیاست، استغناء وتوکل، فہم وفراست، خدمت دین، شغف قرآن کریم، تصوف وطریقت میں انھیں جامعیت نصیب فرمائی تھی، اسلامی مدارس میں پنج گروہ علماء وفضلاء کے درمیان ایک دبدبہ والے عالم نظر آتے تھے اور مسائل علمیہ وفقہیہ کی

تحقیق میں اپنا وقت صرف کرتے، حضرت مولانا اشرف علی تھانوی اور شاہ عبدالقادر رائے پوری کی خانقاہوں میں پہنچ کر ذکر و شغل، مراقبہ، ذلت اور تزکیۂ نفس پر ان کی نظر رہتی، دارالمصنفین اعظم گڈھ اور ندوۃ المصنفین دہلی میں پہنچ کر علمی اور تاریخی انکشافات سے انھیں دلچسپی ہوتی، اپنے گھر پر ہوتے تو علی الصباح اپنے سب مہمانوں اور بچوں کو جمع کر کے قرآن شریف کی تلاوت اور حضرت مولانا شاہ عبدالقادر دہلوی کے ترجمہ کو سامنے رکھ کر پابندی سے تفسیر قرآن پڑھاتے، شاہ صاحب دہلوی کے ترجمہ سے انھیں بڑی دلچسپی تھی، اس ترجمے کے دسیوں ایڈیشن انھوں نے جمع فرمائے تھے، اور انھیں اچھی طرح یاد تھا کہ فلاں آیت قرآنی اور فلاں لفظ کا ترجمہ شاہ عبدالقادر صاحب نے کیا کیا ہے۔ شاہ رفیع الدین دہلوی نے کس طرح اس مفہوم کو ادا کیا ہے اور مولانا اشرف علی تھانوی نے کیا لفظ اختیار کئے ہیں۔

تراجم قرآنی سے انھیں دلچسپی کا یہ عالم تھا کہ انتقال سے تین ماہ پہلے دفتر رسالہ دارالعلوم دیوبند میں میرے پاس تشریف لے آئے اور فرمایا کہ سید محبوب رضوی کو بلاؤ، سید صاحب آئے تو تراجم قرآن پر ان کے ایک مضمون پر تفصیلی گفتگو فرمائی اور ہدایت فرمائی کہ شاہ عبدالقادر کے متعدد نسخے سامنے رکھ کر ایک زائد سے زائد قابل اعتماد ترجمہ مرتب کریں میں اپنی کوشش سے اسے چھاپ دوں گا۔ افسوس ہے کہ اس سے کچھ عرصہ بعد مولانا کا انتقال ہو گیا اور ان کی یہ ہدایت پوری نہ ہو سکی جس پر میرے محترم رفیق جناب سید محبوب رضوی کو آج تک ملال ہے۔

مولانا لدھیانہ اور دہلی میں ہر روز اپنے محلہ کا گشت فرماتے، ہر ہندو اور مسلم پڑوسی سے علیک سلیک اور مزاج پرسی کرتے اور جس کو جو ضرورت ہوتی بے اختیار توجہ فرماتے۔ مہمانوں کی خاطر مدارات، جیل کی زندگی میں ساتھیوں کی خدمت، بیمار ساتھیوں کی تیمارداری ان کا خاص موضوع تھا،

ان کی زندگی میں، میں یا میری والدہ محترمہ جب بھی بیمار ہوئے تو مولانا اصرار کے ساتھ ہمیں لدھیانہ بلا کر مہینوں ہمارے علاج اور پرہیزی کھانے کا بار اٹھاتے، ایک مرتبہ میری والدہ صاحبہ کو بلا کر ڈیڑھ سال تک لدھیانہ رکھا، مہینوں ان کے قیام کے لئے الگ مکان اور ان کی کل ضروریات کا تکفل فرمایا۔ میرے بزرگ مولانا سید محمد ادریس سکھروڈی جو والد محترم حضرت علامہ سید محمد انور شاہ کشمیری کے خادم خاص ہونے کے لحاظ سے حلقۂ انوری کے مخدوم تھے، دہلی میں بیمار ہو گئے تو مولانا انھیں اپنے گھر اٹھا لے گئے اور مہینوں ان کی خدمت کی۔

مولانا کی ۷۰ سال کی زندگی اور سیکڑوں واقعات میرے حافظہ میں ہیں کون کون سا واقعہ لکھوں اور کس کس کو چھوڑوں۔ ۱۹۴۶ء میں میرے برادر مولانا سید انظر شاہ سلمہ، مدرسہ فتحپوری دہلی کے طالب علم تھے، اردو بازار میں حضرت مولانا کی نظر ان پر پڑی فرمایا کہ اس وقت میرے پاس کچھ نہیں ہے شام کو مجھ سے احرار کے دفتر میں مل لینا کچھ مل گیا تو تمہیں دیدوں گا، اور شام کو عزیز موصوف ملے تو دس پندرہ روپے اصرار کے ساتھ ان کی جیب میں ڈالدیئے، سخاوت و فیاضی یہ عالم تھا کہ دسیوں ایسے واقعات میرے حافظہ میں ہیں۔ ان کا کوئی دوست ان سے ملنے آیا، مولانا اسے ضرورتمند سمجھتے ہیں، جب وہ اٹھ کر جانے لگا تو دروازے تک اسے پہنچانے آئے، خاموشی سے کچھ رقم اس کے حوالہ کر دی۔

جرأت و بیباکی، صاف بیانی میں اپنی مثال آپ تھے، گاندھی جی، جواہر لال اور مولانا آزاد دل سے ان کی قدر فرماتے تھے، ان کے مشوروں کو گوش ہوش سے سنتے تھے اور مولانا بے دھڑک اپنے دل کی بات ان سے کہہ دیتے اور ان کی سرگرمیوں پر انھیں ٹوکتے تھے، بہت سے لوگوں کو یہ بات معلوم ہو گی کہ گاندھی جی کی پرارتھنا سبھا میں جب بم کا حادثہ پیش آیا تو مولانا مرحوم دوسرے روز گاندھی جی سے ملے اور فرمایا کہ اب اس واقعہ کے بعد آپ کی

زندگی کا کوئی بھروسہ نہیں، یا تو اپنی ان سبھاؤں کو ختم کرو یا مرنے کے لئے تیار رہو، گاندھی جی نے کہا کہ مولانا صاحب مجھے مرنا منظور ہے، لیکن جو بات میرے ذہن میں ہے اسے چھپا نہیں سکتا چنانچہ اس پکے ارادے کے آدمی نے موت قبول کی مگر فرقہ واریت سے سمجھوتہ نہیں کیا۔

مولانا مرحوم نے گاندھی جی کو اپنے استاذ حضرت علامہ محمد انور شاہ کشمیریؒ سے ملنے پر بھی تیار فرمایا تھا، مگر گاندھی جی ۳۲ء میں گول میز کانفرنس لندن میں تھے کہ حضرت علامہ کا انتقال ہو گیا اور یہ تجویز سامنے نہ آسکی مولانا دو بڑوں کو باہم ملاتے، چھوٹوں کی علمی تہذیبی تربیت فرماتے اور ہر شخص کے مناسب مزاج کام میں لگا دینے کا ملکہ تھا۔ حضرت مولانا تھانوی کے سیاسی مسلک سے مولانا اختلاف فرماتے تھے مگر گاہ بگاہ پوری نیازمندی کے ساتھ حضرت مولانا تھانوی کے یہاں سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ کو ساتھ لے کر حاضری دیتے تھے، شاہ صاحب بخاری کی طرف حضرت علامہ سید محمد انور شاہ کشمیری کو متوجہ فرمانے کا سہرا بھی مولانا ہی کے سر تھا، پنجاب کے متعدد سفروں میں وہ حضرت شاہ صاحب بخاری کو ساتھ لے کر حضرت مولانا انور شاہ کے ساتھ رہے اور بار بار شاہ صاحب بخاری کو لے کر علامہ کے یہاں مقیم اور ان کے فیض صحبت سے مستفید ہوئے کئی دفعہ میرے سامنے شاہ صاحب بخاری سے فرمایا کہ ان کی (حضرت مولانا انور شاہ صاحب کی) باتیں غور سے سن لے، عمر بھر تیرے کام آئیں گی۔

حضرت علامہ انور شاہ مولانا سے ان کے گھر، ان کی اولاد، اور ان کے خاندان سے اس طرح مانوس تھے جیسے اپنے گھر اور خاندان سے یہ واقعہ ہے کہ علامہ انور شاہ وقار و تمکنت کے ایک کوہ گراں بار تھے ہر کہہ و مہ سے ان کا بے تکلف ہونا امر دشوار تھا اور نہ زندگی کے عام

معاملات سے ان کا کوئی رابطہ تھا مگر مولانا سے ان کی محبت یہ تھی کہ جب زمانہ میں مولانا حبیب الرحمٰن ملتان جیل میں قید تھے حضرت علامہ بغیر کسی اطلاع کے لدھیانہ ان کے گھر پہنچ گئے۔ گھر پہنچنے پر مردانہ میں جھاڑو لگی ہوئی تھی اور نہ فرش بچھا ہوا تھا، حضرت علامہ نے گھر میں مولانا کی اہلیہ صاحبہ مرحومہ اور ان کی بچیوں کو کہلوایا کہ جھاڑو اور فرش بھیج دو، اور جھاڑو آگئی تو اپنے خدام سے فرمایا کہ بھائی جھاڑو دو، فرش بچھاؤ، یہ اپنا گھر ہے یہاں کسی بات کا تکلف نہیں، گھر میں کون ہے جو باہر آکر ہمارے بیٹھنے کی جگہ بنائے گا؟ خود اپنا گھر سمجھو۔ میری نظر میں آج بھی وہ منظر محفوظ ہے کہ ۳۲ء میں مولانا مرحوم کے بڑے صاحبزادے مولانا خلیل الرحمان جیل سے رہا ہوئے تو مولانا انھیں لے کر دیوبند حضرت کی خدمت میں حاضر ہوئے، آمنا سامنا ہوا تو مولانا نے فرمایا کہ حضرت یہ خلیل الرحمان ہے، ابھی چند روز ہوئے سال بھر کی سزا جیل سے کاٹ کر آیا ہے۔ حضرت علامہ نے بڑی شفقت کے ساتھ خلیل الرحمٰن کے سر پر ہاتھ پھیرا اور ان کی پیشانی کو بوسہ دیا، کیوں بھائی خلیل الرحمان! یہ واقعہ یاد ہے، لاؤ اپنا سر اور پیشانی مجھے دو جس پیشانی پر علامہ انور شاہ کا بوسہ ثبت ہے اسے کم سے کم غور سے دیکھ لوں اور اس کی زیارت کر لوں۔

مولانا کی زندگی کی دو حقیقتیں اور قابل ذکر ہیں، ایک سیاسیات میں ان کی دیدہ وری، ذہانت، معاملات کو سمجھنے کی صلاحیت اور پس و پیش کو دیکھ کر ایک پختہ رائے قائم کرنے کی عادت، وہ تیسوں برس بعد پیش آنے والے حالات و تغیرات کی بو پہلے پا لیتے اور فرماتے کہ آئندہ چل کر ایسا ہوگا، اور ایک نہیں کئی معاملوں میں تجربہ ہوا کہ انھوں نے جو سوچا تھا وہ صحیح تھا،

تقسیم ملک سے پہلے بار بار انھوں نے فرمایا کہ ملک کا بٹوارہ مسلمانوں

کے لئے دونوں ملکوں میں مضر ہوگا، مسلمان اس طرح ہل ہل جائیں گے کہ انھیں اپنا وجود باقی رکھنا مشکل ہو جائے گا، اسی احساس کے پیش نظر انھوں نے نیشلسٹ مسلمانوں کی صف اول کی قیادت فرمائی اور تقسیم کو رد کرنے کے لئے تقسیم کا مطالبہ کرنے والے مسلمانوں کے بپھرے ہوئے ہجوموں اور مجمعوں کے تشدد کا شکار بنتے رہے۔

لدھیانہ میں ایک وقت ایسا آیا کہ صدیوں کی گہری مقبولیت کے باوجود لیگی طبقہ نے ان کی جان لینے کی بھی کوشش کی۔ مولانا تقسیم ملک کے جو نتائج سوچتے تھے افسوس ہے کہ وہ بعد میں حرف بحرف پورے ہوئے، ۵۴ء میں کشمیر کے اندرونی مسائل کے جھگڑے شروع ہو گئے، مولانا کسی حد تک ان لوگوں کو پسند فرماتے تھے جو اس وقت کشمیر میں برسر اقتدار تھے، مولانا کو معلوم ہوا کہ مجھے کشمیر کے اس حلقے سے ہمدردی ہے جو اس وقت برسر اقتدار تھا، مولانا نے ایک گفتگو میں مجھے کشمیر کے سبھی سیاسی لیڈروں کے ماضی اور حال سے واقف کرایا اور فرمایا کہ تم جس طرح سوچتے ہو بات اس طرح نہیں کشمیر میں یہ کوئی اصولی سیاست کا تنازعہ نہیں بلکہ ذاتی اقتدار کی جنگ ہے بعد کے حالات نے مجھے مولانا کی رائے سے اتفاق کرنے پر مجبور کر دیا۔

دوسری خصوصیت ان کی یہ تھی کہ اپنے مذہبی عقائد اور سیاسی خیالات میں پختہ تھے مگر دوسرے خیالات کے لوگوں سے کھل کر ملتے اور ان سے شفقت آمیز تعلقات رکھتے تھے، یہی وجہ تھی کہ بہت سے خیالات کے افراد ان کے اردگرد جمع ہوتے، سیاسی بحث و مباحثے بھی ہوتے اور مذہبی مسائل پر اظہار خیال بھی، مولانا بھی اپنی پوری قوت کے ساتھ اپنی رائے ظاہر کرتے مگر دوسروں کے خیالات بھی ٹھنڈے دل کے ساتھ سنتے اور ان کی تردید میں ایسا انداز اختیار نہ فرماتے تھے کہ ذاتی طور پر ان لوگوں کی دل شکنی ہوتی مولانا کی ذات اور ان کا گھر سلجھے ہوئے شریف لوگوں، قومی کارکنوں،

پارلیمنٹ اور اسمبلی کے ممبران، اخبار کے ایڈیٹروں، کالجوں کے پروفیسروں دینی مدارس کے علماء، شعراء اور ادبا کا مرکز تھا، سیاسیات سے تعلق رکھنے والے اکثر لوگوں نے ان کی خدمت میں صرف اس لئے حاضری دی کہ ان کے اشارات کی روشنی میں اپنے خیالات مرتب کریں۔

مولانا کے جاننے والے اور ان کے ہزاروں عقیدتمندوں نے ان کے انتقال پر ۱۵۔ ۲۰ برس گذر جانے کے باوجود آج تک نہیں بھولے، اور سچ یہ ہے کہ وہ اتنی قیمتی زندگی رکھتے تھے کہ تاریخ میں ان کا نام ہمیشہ زندہ رہے گا۔

بڑی خوشی اس بات کی ہے کہ مولانا کے صاحبزادگان جو دہلی اور مشرقی پنجاب میں منقسم ہیں، اچھے کاموں میں لگے ہوئے ہیں، مولانا کی قبر جامع دہلی کے شمالی رخ پر ایک مختصر سے قبرستان میں ہے، پچھلے برس میں ان کے مزار پر حاضر ہوا، ایصال ثواب کیا اور پھر دیر تک سوچتا رہا کہ کتنی بڑی زندگی کیا نکھرا ہوا اخلاق، کتنا مضبوط کیرکٹر اور کیسی بے مثال فراست اس گوشۂ قبر میں آسودۂ راحت ہے ؎

خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہو گئیں

اور ؎

زمیں کھا گئی آسماں کیسے کیسے

مولانا آزاد

دارالعلوم دیوبند میں

مولانا آزاد سے فقہی مسلک اور ان کی تفسیر قرآن کے بعض مقامات پر ان کی قرآنی تعبیرات سے میں اختلاف کر سکتا ہوں اور اس کی حیثیت ظاہر ہے کہ صرف علمی اور تحقیقی ہو سکتی ہے مگر مولانا کی ذکاوت وذہانت، ان کی قوت تحریر وتقریر، ملک وقوم کے لئے ان کے اخلاص، ان کی سیاسی سوجھ بوجھ اور ان کی زندگی کے پُروقار اداؤں سے انکار طریق انصاف نہیں۔

مولانا ۱۹۵۱ء میں حکومت ہند کے وزیر تعلیم کی حیثیت سے دارالعلوم میں تشریف لائے۔ اس وقت مولانا حسین احمد مدنی، مولانا اعزاز علی صاحب، مولانا مبارک علی صاحب، مولانا محمد ابراہیم صاحب بلیاوی وغیرہ سب بقید حیات تھے، مولانا آزاد کی یہ ادا آج تک مجھے یاد ہے کہ دارالعلوم کے دفتر اہتمام میں پہنچ کر وہ مسند اہتمام پر تشریف فرما نہیں ہوئے، باوجودیکہ بزرگان دارالعلوم نے اصرار کے ساتھ انھیں اس جگہ بیٹھنے کے لئے کہا مگر انھوں نے اسے دارالعلوم کے احترام کے خلاف سمجھا، دفتر اہتمام میں آنے کے ساتھ ہی مولانا نے فرمایا کہ دارالعلوم کے بزرگ اول مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی میرٹھ کے مطبع ہاشمی میں سات آٹھ روپے ماہانہ کے معاوضہ پر تصحیح کتب کا کام کرتے تھے، باوجودیکہ رام پور، چھتاری، ٹونک وغیرہ کی ریاستیں ان کی بڑی بڑی خدمات انجام دینے کیلئے تیار تھیں

مگر مولانا نے کبھی معاشی روزگار پر زائد توجہ نہیں فرمائی اور آپ نے وقت کا بڑا حصہ علمی، دینی خدمات میں صرف فرمایا۔

دارالعلوم نے مولانا کی ضیافت کے لئے مختصر مگر خوشگوار کھانوں کا اہتمام کیا تھا، کھانے کے وقت علماء فضلاء کا ایک بڑا مجمع ساتھ تھا جس میں حضرت مولانا مدنی، مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی مرحوم بھی تھے، مولانا نے ایک آدھ چپاتی مرغ کے شوربہ کے ساتھ اور اس کے بعد دیوبند کا مشہور گاجر کا حلوہ تھوڑا سا تناول فرمایا، حلوہ پسند کیا اور مولانا نے جواب دیا کہ دیوبند کی اکثر دوکانوں پر حلوہ بنتا ہے، یہ دوکان ہی کا حلوہ ہے۔

صبح کے ۱۰ بجے کے قریب دارالعلوم کے احاطہ نودرہ میں جلسہ ہوا، جس میں عوام و خواص کی حاضری غیر معمولی تھی، میرے علم میں یہ پہلی بات تھی کہ مولانا اعزاز علی صاحب مرحوم نے کسی بڑے آدمی کے لئے قصیدہ تحریر فرمایا ہو، اور اسے مجمع عام میں سنایا ہو، مولانا اعزاز علی صاحب اس دن اپنا سیاہ چوغہ پہنے ہوئے بڑے خوبصورت نظر آرہے تھے، مولانا آزاد کی مدح میں، مولانا نے اپنا قصیدہ سنایا اور مولانا آزاد نے توجہ اور خاموشی کے ساتھ سنا لیکن جب بعد کو دارالعلوم ہی کی طرف سے سپاسنامہ پیش کیا جانے لگا تو مولانا نے جلدی سے اٹھ کر فرمایا کہ سپاس نامہ پڑھنے کی ضرورت نہیں، لائیے یہ سپاس نامہ مجھے عنایت فرمائیے، چنانچہ سپاس نامہ بغیر پڑھے ہوئے مولانا کی خدمت میں پیش کیا گیا۔ اس کے بعد تقریباً آدھ پون گھنٹے مولانا نے تقریر فرمائی جس میں علم کی فضیلت اور علماء، طلباء کے فضائل پر گفتگو فرمائی گئی تھی۔

راقم کو جلسوں میں شرکت اور تقریر سننے کی بالکل عادت نہیں ہے، مولانا شبیر احمد عثمانی، سید عطاء اللہ شاہ بخاری اور مولانا حفظ الرحمٰن جیسے نامور خطیبوں اور مقرروں کی بھی ایک ایک دو دو تقریریں میں سن پایا ہوں

مگر مولانا آزاد کی تقریر سننے کا اشتیاق تھا، راقم نے دفتر اہتمام سے جہاں لاؤڈ اسپیکر پر مولانا کی آواز صاف آرہی تھی، مولانا کی پوری تقریر سنی، اور اس کا پوری طرح احساس ہوا کہ مولانا کا کلام بے حد مرتب، لب و لہجہ مؤثر آواز کا اتار چڑھاؤ دلکش اور مجمع سے خطاب کرنے کا انداز بہت پروقار تھا۔

شام کو مولانا چائے پر دفتر اہتمام میں تشریف فرما تھے اور قریب میں مولانا حبیب الرحمن صاحب بیٹھے تھے، میں کسی کام سے دفتر اہتمام میں گیا تو مولانا حبیب الرحمن نے اپنی شفقت و محبت میں مجھے بلایا اور مولانا آزاد کے سامنے پیش کیا، میرے تعارف میں چند لفظ فرمائے، مولانا آزاد نے توجہ فرمائی، فرمایا کہ تمہارے مضامین اخبارات اور رسالوں میں میری نظر سے گذرے ہیں، رسالہ دارالعلوم بھی میرے پاس آتا ہے۔ اس مختصر گفتگو میں مولانا نے میری والدہ صاحبہ اور بہن بھائیوں کی خیریت بھی دریافت فرمائی۔

مولانا کے اس قیام دارالعلوم کا ایک واقعہ بھی قابل ذکر ہے اکثر لوگوں سے سنا ہے کہ مولانا سگریٹ پینے کے عادی تھے مگر مولانا نے دفتر دارالعلوم اور پورے دارالعلوم میں ایک دفعہ بھی سگریٹ نہیں پی۔

دوسرا یہ واقعہ بھی دلچسپی رکھتا ہے کہ مولانا دارالعلوم کی مختلف عمارتوں میں گھوم پھر رہے تھے کہ اچانک قاری احمد میاں صاحب مدرس درجہ تجوید کی درس گاہ کے سامنے سے مولانا کا گذر ہوا، قاری صاحب کی آواز بہت بھاری، بہت بلند اور فلک شگاف ہے

مگر اس کے ساتھ آواز میں ایک طرح کا اثر ہے، قاری صاحب کو الفاظ کی ادائیگی اور مخارج کی صحت کا اچھا اہتمام ہے، اس وقت قاری صاحب اپنے طلباء کو مشق کرا رہے تھے، مولانا درس گاہ کے سامنے اپنی بید کے سہارے کھڑے ہو گئے اور دیر تک بڑی محویت کے ساتھ کلام پاک سنتے رہے۔

مولانا اس وقت ہلکے گلابی رنگ کی اونی شیروانی، اونی چست پاجامہ اور قراقری کی ٹوپی پہنے ہوئے تھے، یہ لباس ان کے متوازن جسم پر خوب جچتا تھا، ان کی تیز اور روشن آنکھیں ان کی فطری ذہانت اور متانت کا اعلان کرتی تھیں۔

دارالعلوم کی عمارتیں ملک کی موجودہ بڑی یونیورسٹیوں اور کالجوں کے مقابلہ میں زیادہ شاندار اور پرشکوہ نہیں، میری اپنی نظر میں ان سب عمارتوں کے دبے دبے اور بھنچے بھنچے رہنے کی خاص وجہ یہ ہے کہ جس طرح مغل عمارتوں میں بڑی بڑی کرسیوں پر عمارتیں اٹھانے کا انتظام کیا گیا ہے، دارالعلوم کی عمارتوں کے لئے کرسیاں نہیں بنائی گئیں مگر اس کے باوجود یہ عمارتیں دلکش ہیں، ان عمارتوں کو یہ فخر حاصل ہے کہ انھوں نے بڑے بزرگوں کو دیکھا ہے عالم اسلام کی بڑی شخصیتیں اس دارۂ علمی میں آئی ہیں اور اسلامی ملکوں کے بادشاہوں مشغور مدبروں سیاسی لیڈروں اور دانشوروں نے دارالعلوم کو سلام کیا ہے۔

مولانا آزاد کو دنیا سے گذرے ہوئے برسہا برس گذر گئے مگر دارالعلوم میں ان کی تشریف آوری کا یہ واقعہ ایک تاریخی حیثیت سے دارالعلوم کو ہمیشہ یاد رہے گا۔

ڈیوک آف ونڈسر

ابھی چند دن ہوئے خبر آئی کہ ڈیوک آف ونڈسر نے فرانس کے علاقہ میں، جہاں وہ رضا کارانہ طور پر جلاوطنی کی زندگی گذار رہے تھے، اپنی زندگی پوری کی

ڈیوک آف ونڈسر ایڈورڈ ہشتم کے نام سے برطانیہ میں سریر آرائے سلطنت ہوئے تھے، ملکہ الزبتھ کے تایا تھے۔

سلطنت برطانیہ اب تو بہت محدود ہو کر رہ گئی ہے، یہ ۱۹۳۶ء کی سلطنت برطانیہ تھی، اکثر عرب ممالک پر برطانیہ کا قبضہ تھا، مشرق میں ہندوستان، برما اور سنگاپور تک اس کے مقبوضات میں شامل تھے، سلطنت کی حدود اس درجہ وسیع تھیں کہ اس زمانہ میں عام طور پر کہا جاتا تھا کہ برطانیہ میں کہیں سورج نہیں ڈوبتا، مطلب یہ تھا کہ ایک علاقہ میں سورج ڈوبتا ہے تو دوسرے حصہ میں طلوع ہو جاتا ہے۔ امریکہ اس وقت اپنی سیاست کے لڑکپن سے کھیل رہا تھا، روس کو مقامی تنظیم اور ٹریڈ یونینوں کا مشغلہ تھا، سیاست کی عالمی بساط پر نہ امریکہ کا نام تھا نہ روس کا، البتہ جرمنی پہلی جنگ عظیم کی شکست کے بعد ہٹلر کی قیادت میں دوسری جنگ کی تیاریاں کر رہا تھا، اٹلی میں

اصل حکمرانی تو مسولینی کی تھی مگر تخت سلطنت پر بادشاہ بیٹھا ہوا تھا۔ بس چاروں طرف برطانیہ کا بول بالا تھا اور ساری دنیا برطانیہ کے اشاروں پر ناچتی تھی۔

"ڈیوک آف ونڈسر اسی عظیم الشان سلطنت کے بادشاہ بنے اور مشرق و مغرب اور بحر و بر میں پھیلی ہوئی ایک سلطنت نے اپنے تمامتر کروفر اور اقتدار و اختیار کے ساتھ ان کے لئے آغوش کھول دی، سلطنت برطانیہ کے سابق بادشاہوں کی طرح انھیں بھی دل لگا کر تخت شاہی پر بیٹھنا چاہئے تھا مگر انہی دنوں ایک طلاق یافتہ خاتون مسز سمپسن سے ان کی واقفیت ہوئی اور پھر ایڈورڈ ہشتم نے اس سے شادی کا ارادہ کر لیا۔ مسز سمپسن کا تعلق شاہی خاندان سے کچھ نہیں تھا، اس لئے اس شادی پر ساری سلطنت برطانیہ کی ناک بھوں چڑھ گئی اور ملک نے اس شادی پر شدید اعتراضات کئے، اس وقت کے وزیر اعظم مسٹر بالڈون نے ملک کے جذبات کے پیش نظر ایڈورڈ ہشتم کے ساتھ سخت رویہ اختیار کیا اور انھیں بتایا کہ شاہی خاندان سے غیر متعلق خاتون سے ان کی شادی، شاہی خاندان کے لئے بے عزتی کا باعث ہوگی اور برطانوی قوم اس کا صدمہ محسوس کرے گی، ایڈورڈ ہشتم نے جم کر برطانوی قوم اور برطانی وزیر اعظم کا مقابلہ کیا اور خاتون مذکور سے شادی کرنے پر مصر رہے۔ آخر کار اس کش مکش کا خاتمہ سلطنت کی حکمرانی سے ایڈورڈ ہشتم کے استعفے پر ہوا۔ ایڈورڈ نے بادشاہی سے یکسوئی اختیار کی اور محل شاہی سے باہر مسز سمپسن سے شادی کر لی۔

برطانوی سلطنت کو ایڈورڈ کے اس طریقۂ عمل سے بہت دھکا لگا مگر دنیا کے ان ممالک میں جہاں محبت کے قدرداں بستے تھے، خصوصاً

ہندوستان میں جہاں کم از کم ساٹھ فی صدی اشخاص کا محبوب مشغلہ محبت اور شعر و شاعری ہے اور جن کے دن شعر و شاعری کی بادہ پیمائی اور راتیں مشاعروں میں داد کا ہنگامہ بپا کرنے میں گذرتی ہیں، ڈیوک کی بڑی ناموری اور مقبولیت ہوئی، کہا گیا کہ انھوں نے ایک عورت کے لئے نہیں بلکہ اپنی محبت اور شخصی حقوق کے لئے بادشاہی کی قربانی دینے میں کوئی جھجک محسوس نہیں کی۔

چنانچہ مشہور شاعر آغا شاعر قزلباش دہلوی نے جو داغ اسکول کے ہیرو اور زبان و بیان کے اچھے شاعر تھے کہا ؎

کسی کے روکنے سے کب ترا دیوانہ رکتا ہے

بہار آئی، چلا میں یہ دھری ہیں بیڑیاں میری

سیماب اکبر آبادی نے جو اس وقت کے بولتے اور چہکتے ہوئے شاعر تھے، خوب کہا ؎

جسے دیوانگی کہتے ہیں، الفت کی نبوت ہے!

غنیمت ہے جو صدیوں میں کوئی دیوانہ ہو جائے

اخبارات میں ڈیوک کا ایک فوٹو نکلا تھا، تخت شاہی سے دستبردار ہونے کے بعد وہ مسز سمپسن کے ساتھ کرکٹ یا ہاکی کے ایک میچ میں عوام کے ساتھ سادہ طریقہ پر شریک ہوئے اور مجمع میں ایک کونہ پر اس خاتون کے ساتھ کھڑے تھے، سیماب صاحب نے اس موقعہ پر کہا ؎

سر بر قدم حسن، قدم بر کلہ و تاج

دیوانہ بڑی شان سے دیوانہ بنا ہے

انسان کی زندگی اپنے خاتمہ کے ساتھ ایک تاریخ اور ایک کردار کو

ختم کر دیتی ہے۔ ادھر انسان کی زندگی ختم ہوئی ادھر اس سے وابستہ سارے واقعات بھولے بسرے افسانے بن جاتے ہیں ؎

بس اتنی سی حقیقت ہے فریب خواب ہستی کی
کہ آنکھیں بند ہوں اور آدمی افسانہ ہو جائے

اب کہاں ۱۹۳۶ء، کہاں ڈیوک آف ونڈسر اور ان کی محبوبہ، لافانی ذات اللہ ہی کی ہے ورنہ ہر ہنگامہ کی تقدیر خاموشی اور ہر کمال کو زوال ہے، کل جن کے محلوں میں نوبت و نقارہ بجتے اور چنگ و رباب کی آوازیں آتی تھیں آج وہاں ہو کا عالم ہے، اور ایک دردناک سناٹا چھایا ہوا ہے ؕ

(بقیہ صفحہ ۱۵۶ سے آگے)

تم یہ حرکت بالکل نہ کیا کرو۔ یہ تو مولانا کی عام زندگی تھی مگر علم و فضل میں ان کا جو پایہ تھا وہ سب اہل علم پر روشن ہے، استاذ الاساتذہ تھے اور علم اتنا حاضر تھا کہ طلبہ و مدرسین اور عوام جب بھی کوئی سوال کرتے تو مولانا کسی کتاب سے رجوع کئے بغیر بڑا منضبط جواب دیتے، حدیث و تفسیر کے مسلّم استاذ تھے، ان کے علم و فضل میں حضرت نانوتوی اور مولانا احمد حسن امروہوی کے علوم بیکراں کی مشابہت تھی۔

زندگی کے یہ عام معمولات ان کی سادہ دلی اور معصومیت کے نشانات تھے اور ان کا علم و تقویٰ ان کے بہت بڑے عالم اور بہت بڑے بزرگ ہونے کا ثبوت تھی ؕ

حضرت مولانا عبدالرحمٰن امروہوی رح

میرا یہ فخر بیجا نہیں کہ میں نے اپنی زندگی میں ایک فرشتہ صفت انسان دیکھا اور میری زندگی کے کچھ اوقات ان کے ساتھ گذرے، یہ شخصیت مولانا عبدالرحمٰن مفسر امروہوی کی تھی جو مولانا نانوتوی اور مولانا احمد حسن امروہوی کے شاگرد اپنے وقت میں حدیث و تفسیر کی سند اور اپنی بزرگی اور معصومیت کے لحاظ سے پہلے زمانہ کے انسان تھے ابا جی کے انتقال کے بعد مولانا شبیر احمد عثمانی گجرات کے ایک مدرسہ کے صدر مدرس تھے اور مولانا عبدالرحمٰن صاحب مدرس دوئم، حالانکہ مولانا اپنے علم و فضل اور عمر و بزرگی کے لحاظ سے صدارت تدریس کے بجا طور پر مستحق تھے، مولانا بہت بڑے عالم اور بزرگ تھے مگر ان میں بچوں کی ادائیں، بچوں کا معصوم ذہن اور بچوں کی طرح سادہ دلی تھی، ہر نئی چیز سے بچوں کی طرح دلچسپی لیتے، مدرسہ کے طلبہ کبڈی کھیلتے تو بڑے شوق کے ساتھ ان کے مجمع میں جا کر کھڑے ہوتے، جمعہ کی شب میں طلبہ گروپ بنا کر مشق کیلئے تقریریں کرتے تو مولانا وہاں موجود رہتے، گجرات میں ہم جس بنگلہ میں رہتے تھے اس کے سامنے پختہ سڑک تھی اور اس سڑک پر دن میں کئی مرتبہ مردلی اور نوساری سے موٹر آتی، مولانا دوپہر کی چلچلاتی دھوپ میں سڑک پر موٹر کے انتظار میں کھڑے رہتے، موٹر آتی، دو چار مسافر اترتے، مولانا موٹر کے آنے جانے کا نظارہ کرتے اور پھر بنگلہ میں تشریف لے آتے، اخبارات پابندی سے پڑھتے اور ایک دو گھنٹہ یومیہ ضرور اخبارات پر خرچ کرتے، ایک مرتبہ بیمار ہو گئے مجھ سے فرمایا کہ تازہ اخبار سناؤ، اخبار مدینہ سامنے تھا میں نے اس کے پہلے صفحہ سے اس کا مستقل مضمون "دنیائے اسلام" پڑھنا شروع کیا، مولانا نے ٹوکا ہیں یہ کیا؟ شروع صفحہ سے پڑھو، میں نے دریافت کیا کہاں سے؟ تو فرمایا کہ جہاں سے

معجزہ شق القمر کا ہے مدینہ سے عیاں ؎ مہ نے شق ہو کر لیا ہے دین کو آغوش میں

لکھا ہے، یہیں سے پڑھا اور لوح پر لکھی ہوئی ساری تفصیل مجلس ادارت، سالانہ چندہ، مقام اشاعت سب کچھ گوش گذار کی پھر اصل اخبار شروع کیا اور اس کے صرف دو صفحے اسی تفصیل کیساتھ ایک دو گھنٹہ میں پورے ہوئے، مجھے بڑی ہنسی آئی، میرے ہنسنے سے مولانا کو معمولی سی شفقت آمیز ناگواری ہوئی پوچھا کیوں ہنستے ہو، میں نے کہا کہ مدینہ، زمیندار، الجمعیۃ وغیرہ آپ ہمیشہ پڑھتے ہیں پھر اس کی کیا ضرورت کہ انکی لوح بھی پڑھی جائے، اور جو باتیں سینکڑوں دفعہ نظر سے گذر چکی ہیں انھیں دہرایا جائے مولانا نے فرمایا کہ یہ اس لئے ضروری ہے کہ اگر اخبار کا ایڈیٹر بدل گیا ہے، سالانہ چندہ میں کوئی تبدیلی آئی ہے، جو شعر اب تک اخبار پر لکھا جاتا ہے اس کی جگہ کوئی اور شعر لکھدیا ہے تو ہم ان تبدیلیوں سے اسی وقت خبر پائیں گے جب ہم ہر دفعہ یہ چیزیں پڑھتے رہیں، مولانا ہمیشہ بیٹری اپنے ساتھ رکھتے اور رات کو ضرورت کے وقت استعمال کرتے تھے، مگر کبھی بیٹری کو بیٹری یا ٹارچ نہیں کہا ہمیشہ بالٹی فرماتے جب بیٹری کی ضرورت ہوتی تو مجھ سے جلدی جلدی فرماتے بچے بالٹی لانا، بالٹی لانا میں بعض دفعہ شرارتاً بالٹی ہی اٹھالے آتا تو خفا ہونے کے بجائے تبسم فرماتے، مولانا ہر روز اپنے گھر ایک خط پابندی سے لکھا کرتے اور اس کی شکل روزانہ ڈائری کی سی ہوتی کہ دن بھر کے سارے کاموں اور آنے جانے والوں کے نام تحریر فرماتے، میں بچپن کی شوخی اور شرارت میں ان کے اس روزانہ خط کے تجسس میں رہتا، جب بھی موقعہ ملتا اس خط کو پڑھ لیتا پھر دوسرے وقت مولانا ہی کے سامنے کسی اور شخص سے خط کا کوئی حصہ نقل کرتا، مولانا سمجھ جاتے کہ آج اس نے خط پڑھ لیا ہے مگر اتنی بڑی اور مسلسل جسارت پر بھی برا نہیں مانتے تھے بلکہ نرمی سے سمجھاتے کہ دوسروں کا خط پڑھنا بڑے عیب کی بات ہے (باقی مد۔۔۔